تعلیم و تربیت
اکتوبر 2013ء
غلافِ کعبہ
صفحہ نمبر 40
ہُدہُد
صفحہ نمبر 25
ایسا بھی ہوتا ہے
صفحہ نمبر 58
بھیانک رات
www.paksociety.com
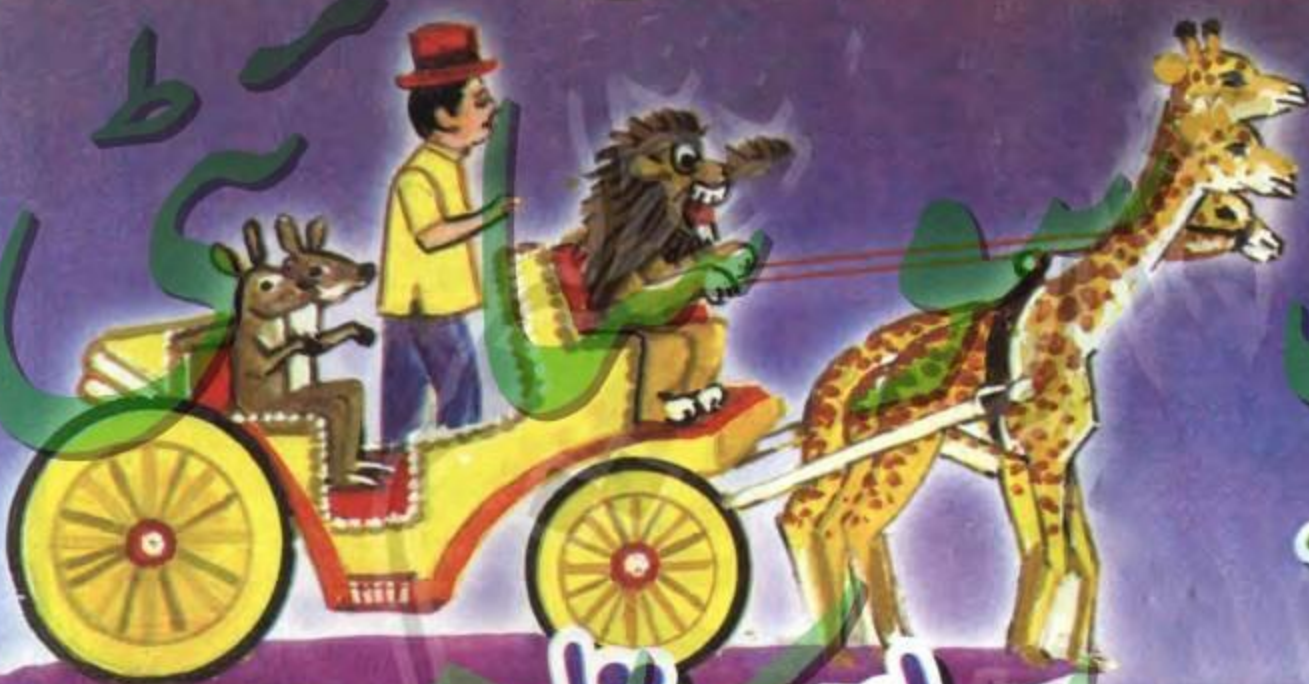
73 واں سال چھٹا شمارہ | رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

## اس شمارے میں



اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

### السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

حضرت عمرؓ ایک دفعہ رات کے وقت مدینہ کی گلیوں میں گھوم رہے تھے۔ آپؓ نے دیکھا کہ ایک خیمے میں بڑھیا بیٹھی ہوئی ہے۔ آپؓ اس کے پاس گئے اور پوچھا: ''بڑی بی، عمرؓ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''خدا عمرؓ کا بھلا نہ کرے۔'' حضرت عمرؓ یہ سن کر بولے: ''بڑی بی، یہ بددُعا تم نے کیوں دی؟ عمرؓ سے ایسا کیا قصور ہوا ہے؟'' بڑھیا کہنے لگی: ''عمرؓ نے آج تک مجھ غریب کی خبر نہیں لی۔'' حضرت عمرؓ نے کہا: ''بھلا عمرؓ کو کیا خبر کہ اس خیمے میں کوئی ایسی عورت رہتی ہے جسے مدد کی ضرورت ہے۔'' بڑھیا بولی: ''واہ یہ خوب ہے، ایک شخص لوگوں کا حاکم ہو اور اسے لوگوں کے حال کی خبر نہ ہو۔'' یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اپنے آپ سے کہنے لگے، اے عمرؓ! تجھ سے تو یہ بڑھیا ہی عقل مند نکلی۔ پھر آپؓ نے بڑھیا سے کہا: ''بڑی بی، یہ تکلیف جو تمہیں عمرؓ سے پہنچی ہے، تم میرے ہاتھ بیچ دو تا کہ قیامت کے دن عمرؓ سزا سے بچ جائے۔ تم جو مانگو گی میں دوں گا۔'' بڑھیا نے کہا: ''اچھا! تو پچیس دینار دے دو۔''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی وہاں آ گئے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو ''یا امیر المومنین'' کہہ کر سلام کیا تو بڑھیا کو پتا چلا کہ یہ تو خود حضرت عمرؓ ہیں۔ وہ بڑی پریشان ہوئی۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کہنے لگے: ''بڑی بی، گھبراؤ مت! خدا مجھ پر رحم کرے، تم بالکل سچی ہو۔'' پھر آپؓ نے کاغذ پر یہ عبارت لکھی کہ عمرؓ بن خطاب نے اس بڑھیا سے اس کی تکلیف اور پریشانی جو اسے عمرؓ کی خلافت شروع ہونے سے اب تک اٹھانی پڑی ہے، پچیس دینار میں خرید لی ہے۔ اب یہ بڑھیا قیامت کے دن اللہ کے سامنے عمرؓ کی شکایت نہیں کرے گی۔ حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ نے اس پر گواہوں کی حیثیت سے دستخط کیے۔ حضرت عمرؓ نے بڑھیا کو پچیس دینار دیے اور پھر وہ کاغذ اپنے بیٹے کو دے کر کہا: ''اسے حفاظت سے رکھنا اور جب میں مر جاؤں تو اسے میرے کفن میں رکھ دینا۔'' اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو رعایا کے دُکھ درد کا کتنا خیال رہتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ خود تکلیف اٹھا لیں لیکن رعایا کو تکلیف نہ ہونے پائے۔

ماہِ اکتوبر کی 16 تاریخ کو شہیدِ ملت لیاقت علی خاں کی 62 ویں برسی منائی جائے گی۔ 16 اکتوبر 1951ء کو راول پنڈی کے ایک جلسے میں ایک افغان سید اکبر نے آپ کو گولی مار کر شہید کر دیا۔ آپ پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم اور بانیٔ پاکستان کے قابلِ اعتماد ساتھی تھے۔ آپ نے 1923ء میں آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور قائدِ اعظم کے ساتھ مل کر تحریکِ پاکستان کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ قائدِ اعظمؒ جدوجہدِ پاکستان کے لیے آپ کی کوششوں کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے تھے۔ 26 دسمبر 1943ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: ''لیاقت علی خان میرے دستِ راست ہیں جو تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ کے لیے دن رات کام کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت شاید چند لوگوں کو ہی معلوم ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ کے کام کا کتنا بوجھ اپنے کندھوں پہ اٹھا رکھا ہے۔ ان کے متعلق مجھے یہ کہنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے کہ انہیں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے۔ وہ نواب زادہ ضرور ہیں لیکن اپنی ذہنی ساخت کے لحاظ سے ایک عام آدمی ہیں۔ میں اُمید رکھتا ہوں کہ ملک کے دوسرے نواب اور جاگیر دار بھی ان کی پیروی کریں گے۔'' انہوں نے ایک بار کہا تھا کہ اگر پاکستان کے لیے خون بھی بہانا پڑا تو لیاقت علی خاں کا خون بھی اس میں شامل ہوگا اور پھر ایسا ہی ہوا۔

اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء اور تجاویز سے آگاہ کیجیے۔ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔ فی امان اللہ! (ایڈیٹر)


| چیف ایڈیٹر | ایڈیٹر، پبلشر | اسسٹنٹ ایڈیٹر | مشیر | سرکولیشن اسسٹنٹ |
|---|---|---|---|---|
| عبد السلام | ظہیر سلام | عابدہ اصغر | سعید لخت | محمد بشیر راہی |

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔



خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com



پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 25 روپے

## حمد باری تعالیٰ

فلک پر جو ہیں چاند سورج ستارے
خدا کی خدائی کے عنوان سارے
اسی کے سمندر اسی کے ہیں دریا
اسی کے ہیں چشمے، اسی کے ہیں دھارے

وہی سب کا خالق وہی سب کا مولا
سبھی مانگتے ہیں اسی کے سہارے

گلوں میں بھی وہ ہے تو خوشبو میں بھی وہ
گلستاں گلستاں اسی کے نظارے

امیروں کو دولت اسی نے ہے بخشی
غریبوں کے بھی کر رہا ہے گزارے

اسی نے ہماری ہے قسمت بنائی
اسی نے ہمارے مقدر سنوارے
وہی ہم کو دیتا ہے پھل، پھول، خوشبو
اسی نے یہ تحفے جہاں میں اتارے

وہی دے رہا ہے یہ بارش کی ٹھنڈک
وہی دے رہا ہے تپش کے شرارے
وہی اس کے الطاف پاتا ہے زیادہ
جو دن رات اس کی وفا میں گزارے

ڈبوتا ہے منجدھار میں بھی وہ کشتی
وہی پھر لگاتا ہے اس کو کنارے

ریاض احمد قادری

## نعت رسول مقبولؐ

غرور اپنا ہو کیوں کر کم، محمدؐ میرے آقا ہیں
مجھے دُنیا کا کیا ہے غم، محمدؐ میرے آقا ہیں

نبیؐ کے پیار کی قیمت نہ سونے میں نہ چاندی میں
عبث دینار اور درہم، محمدؐ میرے آقا ہیں

غلام ان کا جو بن جاؤں تو تکلیفیں اِک اِک کر کے
پریشاں زلف کے سب ختم، محمدؐ میرے آقا ہیں

کہ جب سے کالی کملی کا ملا اک سائباں مجھ کو
کڑکتی دھوپ کا کیا غم، محمدؐ میرے آقا ہیں
میری سرکار جنت ہیں، میری سرکار رحمت ہیں
گل کے واسطے شبنم، محمدؐ میرے آقا ہیں

ستایا عمر بھر جن کو کفارِ مکہ نے
مگر جو نہ ہوئے برہم، محمدؐ میرے آقا ہیں

پیام ان کا ریاضؔ آیا ہوئے جذبات بے قابو
خوشی سے آنکھ ہے پُرنم، محمدؐ میرے آقا ہیں

سید ریاض گیلانی

بچوں کو جانوروں سے محبت ہونا ایک فطری بات ہے۔ یقیناً آپ سب بھی جانوروں سے محبت کرتے ہوں گے۔ جب بقر عید کے دن قریب آتے ہیں تو آپ کی یہ محبت اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ گرمی ہو یا سردی، دن ہو یا رات جانوروں کی دیکھ بھال میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کی جاتی اور جانوروں کی راحت و آرام کے فکر میں اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں رہتا اور یوں کبھی تو امی ابو سے ڈانٹ بھی کھانی پڑتی ہے اور پھر جب قربانی کا دن آتا ہے (۱۱ ذی الحجہ) تو یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ اُدھر جانور کے گلے پر چھری چل رہی ہوتی ہے اِدھر آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔

کیوں بچو! ایسا ہوتا ہے نا؟ لیکن آپ میں سے بہت سے اس بات سے ناواقف ہوں گے کہ جانور کیوں قربان کیے جاتے ہیں؟ اور اس قربانی کی ابتداء کب سے ہوئی؟

آیئے! اس سلسلہ میں قرآن و حدیث سے راہ نمائی لیتے ہیں۔

اللہ کے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ نبیوں کا خواب سچا ہوتا تھا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ سعادت مند بیٹے نے جواب دیا: اے ابا جان: آپ کو جو حکم ہوا ہے، اس پر عمل کیجئے۔ آپ مجھے ان شاء اللہ صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ چناں چہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسماعیل کو مکہ سے لے کر چلے اور منیٰ میں جا کر ذبح کرنے کی نیت سے ایک چھری ساتھ لی۔ منیٰ، مکہ معظمہ سے تین میل دُور دو پہاڑوں کے درمیان بہت وسیع میدان ہے۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ ابھی ذبح نہ کرنے پائے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آواز آئی: ”اے ابراہیم! تم نے اپنا خواب سچا کر دکھایا۔“

پھر اللہ تعالیٰ نے ایک مینڈھا بھیجا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی جگہ ذبح کیا۔ ذبح تو مینڈھا کیا اور ثواب مل گیا بیٹے کی قربانی کا، کیوں کہ دونوں، باپ اور بیٹا دل سے اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار تھے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور بیٹا ذبح ہونے کے لیے بخوشی لیٹ گیا۔

اس کے بعد اللہ رب العزت کی رضا کے لیے جانوروں کی قربانی کرنا عبادت میں شمار ہو گیا اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے بھی قربانی کا حکم ہوا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ طریقہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جاری ہوا ہے اور یہ ان کا طریقہ چلا آ رہا ہے۔

(سنن ابن ماجہ، کتاب الاضاحی: 3127، مسند احمد، مسند الکوفین: 19283)

پیارے بچو! قربانی تو اس پر فرض ہے جو صاحبِ حیثیت (مال دار) ہو لیکن اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اپنے عام معاملات میں ایثار و قربانی کو فروغ دیں اور اسی جذبہ کے تحت اپنے غریب دوست اور ساتھیوں کی مدد کریں، تو کیوں بچو! آپ اس پر عمل کریں گے نا؟ ان شاء اللہ!

رات کا پچھلا پہر تھا۔ عنایت علی کھیتوں کو پانی دینے گھر سے نکلا تھا۔ آج نہر کے پانی کی ان کی باری تھی۔ اس نے بیوی کو آواز دے کر کنڈی لگانے کو کہا اور کھیتوں کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کا بھائی مہر علی کھیتوں کے پاس ہی سو رہا تھا مگر عنایت علی کو معلوم تھا کہ اسے نیند میں ہرگز یاد نہیں ہوگا کہ پانی کی باری ان کی ہے۔ آج کی رات نکل جاتی تو اگلے پندرہ دن تک انتظار کرنا پڑتا۔ کھیت کھلیان ویسے ہی سوکھے پڑے تھے، کئی ہفتوں سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ اس علاقے میں پانی کی بہت قلت تھی۔ وہ کندھے پر چادر ڈالے تیز تیز قدموں سے جا رہا تھا کہ اچانک اسے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں دو روشنیاں نظر آئیں اور دوسرے ہی لمحے جیسے کسی عفریت نے اسے اپنے نوکیلے پنجوں میں دبوچ لیا۔

گاؤں میں عنایت علی کی ڈھونڈیا پڑی تو کھوجی نے بتایا کہ عنایت علی کو ناگ (شیر) اٹھا کر لے گیا ہے۔ جنگل سے آنے والے راستے پر شیر کے پنجوں کے بڑے واضح نشان تھے اور ان کے ساتھ ایک انسانی جسم کے گھسیٹے جانے کے نشان بھی تھے جو جنگل کی طرف جا رہے تھے۔

یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ میجر ڈارسی کی ایک ہفتہ پہلے شادی ہوئی تھی کہ اسے حکومت کی طرف سے حکم نامہ موصول ہوا کہ اسے فوری طور پر ایک آدم خور شیر کا شکار کرنا ہے۔ مشرقی پنجاب میں ایک دیہی آبادی کے پاس گھنے جنگل میں ایک آدم خور شیرنی پائی جا رہی ہے۔ اگرچہ اس نے بھی ابھی تک ایک ہی انسانی شکار کیا ہے اور اس کی لاش اٹھا کر لے گئی ہے لیکن آس پاس کے علاقوں میں انتہائی خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ دیہاتی لوگ اس بات سے بے حد سراسیمہ ہیں کہ شیرنی دوسرے شکار کی تلاش میں دوبارہ نہ آ جائے۔ جہاں سے عنایت علی کے باقیات ملے تھے وہیں آس پاس شیر اور دو تین شیر خوار شیر کے بچوں کے نشانات بھی ملے تھے اور یہ بات مسلم تھی کہ بچے شیرنی کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ میجر ڈارسی ایک پیشہ ور شکاری تھا اور اسے شیروں کے شکار کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنی خوب صورت اور چہیتی بیوی کے ساتھ کشمیر کی حسین وادیوں میں سیر و تفریح میں مصروف تھا جب اسے حکم نامہ ملا۔ تاخیر کی بالکل گنجائش نہیں تھی۔ شیرنی کسی بھی وقت اپنا دوسرا شکار کرنے آ سکتی تھی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس شیر کے منہ کو انسانی خون لگ جائے تو

پھر اسے کسی دوسرے جانور کا گوشت نہیں بھاتا۔
میجر ڈارسی کی بیوی خود بھی ایک شکاری کی بیٹی تھی۔ اس نے ڈارسی سے ضد کی کہ وہ اس کے ساتھ شکار پر جانا چاہتی ہے۔ میجر ڈارسی نے حیل وحجت کی تو مریم نے اسے بتایا کہ اسے بھی شکار کا تجربہ ہے اور وہ خود ایک زندہ شیر کو پکڑوا کر چڑیا گھر بھجوا چکی ہے۔ میجر کو بیوی کی بات ماننا پڑی۔ وقت بہت کم تھا۔ وہ دونوں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مزید چار شکاریوں کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس ٹیم کی قیادت کرنل ڈارسی کر رہا تھا۔
رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ ایک گھنے درخت کی شاخوں پر مچان لگائے میجر اپنی بیوی اور چاروں ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا، گاؤں کا ایک ماہر کھوجی بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اس مخصوص درخت پر مچان لگنے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں آس پاس زمین پر شیرنی کے پیروں کے نشانات پائے گئے تھے جو سیدھے ایک انسانی آبادی کی طرف جا رہے تھے۔ میجر ڈارسی شکاری ہونے کے باوجود ایک رحم دل آدمی تھا۔ وہ ایسی شیرنیوں کو شکار کرنے سے گریز کرتا تھا جن کے بچے ان کے ساتھ ہوں مگر یہاں معاملہ دوسرا اور بہت گھمبیر تھا۔
آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی مگر ابھی تک شیرنی برآمد نہیں ہوئی تھی۔ آج شیرنی کو پچھلا شکار کیے چار پانچ دن ہو چکے تھے اور امید تھی کہ وہ آج شکار کی تلاش میں ضرور نکلے گی۔ آدم خور شیر کو چونکہ انسانی شکار کی تلاش ہوتی ہے، اس لیے وہ بہت زیادہ محتاط ہوتا ہے۔ میجر ڈارسی اور اس کے ساتھی مچان پر بیٹھے انتظار کرتے کرتے اکتا گئے اور ان پر نیند کا غلبہ طاری ہو رہا تھا۔ مریم نے تھرماس میں سے گرم گرم کوفی نکال کر سب کو پیش کی۔ تھکن اور اکتاہٹ کے باوجود میجر پوری طرح چوکس تھا اور اس کی نظریں سامنے کی طرف جمی تھیں جہاں سے شیرنی کی آمد متوقع تھی۔ رات کا تیسرا پہر تھا اور آخری تاریخوں کا چاند درختوں کے پیچھے سے طلوع ہو کر اپنی زرد اور تھکی ہوئی روشنی پھیلا رہا تھا۔ اس روشنی میں میجر ڈارسی نے ایک درخت کے عقب سے شیرنی کو برآمد ہوتے دیکھا اور بغیر کسی توقف کے اپنی بندوق سے فائر کر دیا۔ شیرنی فوراً ہی زمین پر ڈھیر ہوگئی اور دوسرے ہی لمحے اس کے دو بچے بھاگتے ہوئے آئے اور اپنی ماں کی لاش کے چاروں طرف چکر لگانے لگے۔ میجر کو ایک زبردست جھٹکا لگا تو شیرنی اس وقت شکار کے لیے نہیں نکلی تھی بلکہ شاید اپنے بچوں کو گھمانے پھرانے کے لیے اپنی کچھار سے باہر آئی تھی۔ بہرحال کسی بھی صورت میں کوئی خطرہ تو مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک آدم خور شیرنی تھی، اسے تو مارنا ہی تھا۔ ابھی میجر نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی کہ مریم نے مچان سے چھلانگ لگا دی اور تیزی سے آگے جا کر دونوں بچوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ بچے اپنی بدقسمتی سے بے خبر مریم کی گود میں آ کر مطمئن ہوگئے تھے۔ وہ اتنے چھوٹے تھے کہ ابھی شیرنی انہیں انسان دشمنی کا سبق نہیں سکھا سکی تھی۔
آدم خور شیرنی کے مرنے پر ہر طرف دھوم مچ گئی۔ میجر ڈارسی، مریم اور ان کے ساتھیوں کی بڑی بڑی تصویریں اخبارات میں شائع ہوئیں۔ ریڈیو پر میجر اور اس کی بیوی کے انٹرویوز نشر ہوئے، مگر پہلی بار میجر کو اپنی کامیابی کی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے شیرخوار بچوں کو ان کی ماں سے محروم کر دیا تھا۔ وہ بہتیرا اپنے آپ کو سمجھاتا کہ ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ اس کا اوّلین فرض یہی تھا کہ گاؤں کے غریب لوگوں کو آدم خور شیرنی کے عذاب سے بچائے، مگر وہ کسی صورت مطمئن نہیں ہو پاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسے شیرنی کے دونوں بچوں پر بے حد پیار آتا تھا اور مریم تو ہر بات سے بے خبر ان بچوں کی پرورش میں مصروف تھی۔
میجر ڈارسی کی چھٹیاں ابھی باقی تھیں۔ وہ دونوں چاہتے تو دوبارہ سیر وتفریح کے لیے کہیں جا سکتے تھے مگر وہ شیرنی کے بچوں کو ملازموں پر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ وہ دونوں ان بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پال رہے تھے۔ ان میں سے جو مادہ شیر تھی وہ میجر ڈارسی کو زیادہ ہی عزیز تھی۔ وہ اسے اپنی شیر بیٹی کہا کرتا تھا۔
مریم کے والد کا اپنا سرکس تھا۔ جنگلوں سے مختلف جانوروں کو پکڑ کر لایا جاتا تھا اور انہیں سرکس کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔ اس زمانے میں سرکسوں کا بہت رواج تھا اور لوگ ان میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ مریم اپنے سرکس میں ایک رنگ ماسٹر کے فرائض سرانجام دیتی تھی۔ رنگ ماسٹر وہ ہوتا ہے جو نہ صرف جانوروں کو تربیت دیتا

ہے بلکہ سرکس دیکھنے والوں کے سامنے ان کے کرتب بھی پیش کرتا ہے۔ اس کے لیے اس کو رنگ کے اندر رہنا پڑتا ہے کیوں کہ جانور صرف اس کی بات سمجھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ وہ جگہ جہاں کرتب دکھائے جاتے ہیں ''رنگ'' کہلاتا ہے۔

اسی اثناء میں مریم کے والد کا انتقال ہو گیا اور مریم کے سوا کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے یہ سرکس میجر ڈارسی اور مریم کے ہاتھ میں آ گیا۔ میجر کو تو ویسے ہی جانوروں سے دلچسپی تھی۔ وہ شوقیہ جانوروں کو پکڑ کر انہیں چڑیا گھر یا سرکس والوں کو مہیا کیا کرتا تھا اور اب تو وہ خود کسی سرکس کا مالک تھا۔ اس نے فوج سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ مریم نے بخوشی رنگ ماسٹر کے فرائض انجام دینا قبول کر لیا۔ دونوں کی باہمی دلچسپی سے بہت جلد یہ سرکس پورے ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ شیرنی کا بچہ تو ابتدائی دنوں میں ہی مر گیا تھا۔ اب صرف شیرنی ان کے پاس رہ گئی تھی۔ مریم اسے بھی سدھا رہی تھی۔ اب وہ پوری شیرنی بن چکی تھی۔ وہ ایک بہت خوب صورت اور شان دار شیرنی تھی۔ وہ میجر ڈارسی سے بہت زیادہ مانوس تھی۔ میجر بھی اسے شیر بیٹی کہتا تھا۔ وہ اپنا نام پہچاننے لگی۔ جب بھی میجر اسے اس نام سے پکارتا وہ دوڑی چلی آتی حالاں کہ مریم نے بھی اسے پیار سے پالا تھا لیکن اسے سدھانے کے لیے مریم کو اس کی پٹائی بھی کرنی پڑتی تھی۔ اب وہ مریم اور اس کی چابک سے اتنا ڈرنے لگی تھی کہ مریم کو دیکھتے ہی دبک کر بیٹھ جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو مریم کو احساس ہوتا تھا کہ شیر بیٹی اس سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی ہی بات ہوتی تھی مگر مریم اسے اپنا وہم سمجھ کر ٹال دیتی۔ آخر اس نے اسے اپنے ہاتھوں سے پالا تھا، بھلا وہ اس سے کیسے نفرت کر سکتی تھی۔ ان دونوں کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ دونوں شیر بیٹی کو ہی اپنی اولاد مانتے تھے۔ شیر بیٹی گھر میں آزاد پھرتی تھی۔ اسے تربیت کے لیے رنگ میں جانا سخت ناپسند تھا مگر مریم اتنی شان دار شیرنی کو ضائع تو نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سرکس کے تماشائیوں میں بے حد مقبول تھی اور اس کے بغیر لوگ سرکس دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔

مریم سرکس (میجر نے اپنے سرکس کو یہی نام دیا تھا) ان دنوں اپنے عروج پر تھا اور آج کل ریاست ملیر کوٹلہ میں اپنے کمالات دکھا رہا تھا۔

آج مریم سرکس میں لوگوں کا پسندیدہ شو جاری تھا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں سرکس میں موجود تھے اور سرکس کے مختلف کرتبوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ کرتبوں کے ساتھ ساتھ وہ جوکروں کی حماقتوں سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آخر اس شو کی باری آئی جس کا تماشائی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ مریم چست سیاہ لباس میں چار پانچ شیروں کے ساتھ رنگ میں موجود تھی۔ شیر اور شیرنیاں اس کے اشاروں پر مختلف کرتب دکھا رہے

(کہانی کا بقیہ حصہ صفحہ 39 پہ ملاحظہ کریں)

ادھورے کاموں سے ہمیشہ ادھوری خوشیاں ملتی ہیں

# مزہ نہیں آتا

عبدالرشید فاروقی

دادا جان نے اپنے بچوں کو اپنے سامنے دھرنا دیے دیکھا تو دھیرے سے مسکرائے۔ نیچے کھسکتی ہوئی عینک کو دوبارہ ناک پر جمایا اور گویا ہوئے:

"اچھے بچو! کہانی تو آپ کو سناؤں گا، پہلے یوں کرو کہ آج دن بھر تم لوگوں نے جو جو کام کیے ہیں، ذرا ان کے بارے میں بتاؤ۔"

خلافِ توقع دادا جان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر سبھی نے بُرے بُرے منہ بنائے، پھر ایک ساتھ بولے:

"یہ کیا بات ہوئی، دادا جان؟"

"یہی تو بات ہے، میرے بچو! یوں کرو، جلدی سے اپنے اپنے کام گنواؤ۔ آخر معلوم تو ہو کہ تم دن بھر کیا کرتے رہتے ہو۔"

بچوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر خرم کہنے لگا:

"ٹھیک ہے، پہلے میں بتاتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ بولنے لگا:

"دادا جان! آج صبح جب میں اسکول پہنچا تو میرے دوست لیاقت نے اپنی کاپی مانگی، یہ کاپی اس نے تین دن پہلے ڈرائنگ بنانے کے لیے مجھے دی تھی۔ آپ کو معلوم ہے، میری ڈرائنگ بہت اچھی ہے۔ میرا یہ دوست اپنا ڈرائنگ کا کام مجھ سے ہی کرواتا ہے۔ چونکہ میں نے اس کا کام پورا نہیں کیا تھا، اس لیے آج بھی اس سے معذرت کر لی کہ ابھی ڈرائنگ مکمل نہیں ہوئی۔ دادا جان! معذرت کرتے وقت میں بے حد شرمندہ تھا۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی بات نہیں جو قابل ذکر ہو۔" خرم بات مکمل کر چکا تو اشرف جلدی سے کہنے لگا:

"اس کا مطلب ہے، میں بھی کوئی ایسی بات بتاؤں، جس پر مجھے شرمندہ ہونا پڑا تھا۔"

دادا جان کے ذہن میں ایک خیال آیا، جھٹ بولے:

"ٹھیک ہے، سبھی ایسی باتیں یا کام بتاؤ، جن پر تمھیں شرمندگی اٹھانا پڑی ہو۔"

ان کے خاموش ہوتے ہی اشرف کہنے لگا:

"دادا جان! امی مجھے کئی دنوں سے کہہ رہی ہیں، میں پانچ وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کیا کروں۔ میں روز ان سے وعدہ کرتا ہوں، لیکن......وہ جب بھی پوچھتی ہیں، آج جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں تو دادا جان، مجھے بے حد شرمندہ ہونا پڑتا

ہے...... میرا وعدہ اُدھورا رہتا ہے...... پورا نہیں ہوتا۔“

اس کے خاموش ہوتے ہی تارا بولی:

”داداجی! میری ڈرائنگ کی کاپی نامکمل ہے...... روز سوچتی ہوں، مکمل کرلوں، مگر وہ تین دنوں سے اُدھوری ہی پڑی ہے...... مجھے کوئی دوسرا تو شرمندہ نہیں کرتا، ہاں خود سے شرمندہ ہوتی ہوں کہ کیسی لڑکی ہوں۔ اپنا کام مکمل نہیں کرسکتی!!“ تارا کے خاموش ہوتے ہی باقی تینوں بچوں نے بھی اپنی اپنی باتیں کہیں...... سب بچوں کی باتیں سن کر داداجان نے ایک بھرپور نظر ان پر ڈالی اور دھیمی آواز میں کہنے لگے...... تمام بچے ہمہ تن گوش تھے:

”مجھے خوشی اس بات کی ہے، تم سچ بولتے ہو۔ میری دُعا ہے، بڑے ہوکر بھی یوں ہی سچ بولو...... آج میں تم لوگوں کو ایک بڑی زبردست کہانی سناؤں گا۔ کہانی کے اختتام پر کچھ سوال پوچھ کر، انعامات بھی دوں گا...... تم پوری توجہ سے کہانی سننا۔“ وہ اتنا کہہ کر چپ ہوگئے۔ نزدیک ہی موجود تپائی پر پانی سے بھرا گلاس پڑا تھا، انہوں نے گلاس اٹھایا اور سنت کے مطابق پانی پینے لگے۔ پھر گلاس واپس رکھتے ہوئے گویا ہوئے:

”ایک جنگل میں دو خوب صورت بندر رہتے تھے۔ دونوں بھائی تھے۔ اُن میں بڑا پیار تھا۔ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ بڑا بھائی مانکی بہت طاقت ور تھا، جب کہ چھوٹا منکی اس کی نسبت کمزور تھا۔ مانکی اور منکی کے والدین کافی عرصہ پہلے فوت ہوگئے تھے۔ دونوں بھائی حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے بڑے ہوئے تھے۔

اچھے بچو! اس جنگل میں اور بھی جانور رہتے تھے۔ رنگ برنگے پرندے اور اللہ کی دوسری چھوٹی چھوٹی مخلوق بھی رہتی تھی۔ تمہیں تو معلوم ہے، جنگل کا بادشاہ شیر ہوا کرتا ہے۔ اس جنگل کا بھی ایک بادشاہ تھا۔ بڑا اچھا...... آج کل کے انسانوں کے بادشاہوں سے بھی زیادہ اچھا...... جنگل کے سارے جانور اور پرندے اس سے بہت راضی تھے۔ ایک دن شیر بادشاہ کا بیٹا غائب ہوگیا۔ شیر اور تمام جانوروں نے مل کر اُسے بہت تلاش کیا مگر وہ مل نہ سکا۔ شیر بادشاہ بہت پریشان تھا۔ اسے اپنے بیٹے سے بے حد محبت تھی۔ شیرنی کی وفات کے بعد، اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو پوری توجہ سے پالا تھا۔

اپنے بادشاہ کو پریشان اور رنجیدہ دیکھ کر جانور بھی دُکھی ہوگئے۔ سب نے مل کر ایک بار پھر ننھے شیر کو تلاش کیا مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مانکی اور منکی سے اپنے رحم دل بادشاہ کا دُکھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا، وہ ننھے شیر کو تلاش کریں گے اگر تمہیں کسی سے پیار ہے تو تم اُسے بتائے بغیر، اس کی مدد کرو ان دونوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ ننھے شیر کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

اس جنگل کے ساتھ ایک بڑا دریا بہتا تھا۔ دونوں بھائی ننھے شیر کو تلاش کرتے کرتے اس طرف آنکلے۔ تھکن سے ان کا بُرا حال تھا۔ وہ ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ مانکی نے منکی کو پکارا:

”منکی بھائی! میں بہت زیادہ تھک گیا ہوں، لیکن اس وقت تک آرام سے نہیں رہوں گا جب تک شیر بادشاہ کے بیٹے کو تلاش نہیں کرلیتا۔“

”ہاں! ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔“ منکی نے کہا۔

وہ ابھی باتیں کرہی رہے تھے کہ اچانک دریا کے پانی میں شور ہوا...... بڑی بڑی لہریں اُٹھنے لگیں...... دونوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پانی میں بھونچال سا آیا لگتا تھا۔ دونوں بھائی بزدل نہیں تھے، تاہم اس وقت خوف زدہ ہو رہے تھے اور پھر یکایک اُن کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں...... پانی سے برآمد ہونے والی چیز تھی ہی اتنی خوف ناک...... وہ بھاگنا چاہتے تھے مگر...... پاؤں ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ خوف ناک چیز پانی سے نکل کر ان کے پاس چلی آئی۔ انہوں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ قریباً چھ فٹ لمبی، بڑے بڑے زمین کو چھوتے ہوئے بال، رنگ سبز مائل سرخ اور سر کے اوپر ایک تاج...... چمکتا ہوا تاج تھا۔ چہرہ نہایت بھدا اور خوف ناک۔ غرض اس کا حلیہ بے حد ڈراؤنا تھا۔ وہ مانکی اور منکی کے سامنے کھڑی تھی اور ٹکر ٹکر انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے خود پر کسی حد تک قابو پالیا تھا۔ پھر مانکی بولا:

”کون ہو تم......؟“

”میرا نام اربن فش ہے۔“ اس کی آواز عجیب مگر باریک سی تھی۔

”اربن فش...... مم...... مگر تم مچھلی تو کہیں سے بھی نہیں لگتی؟“

”میں مچھلی ہوں ذرا اور قسم کی......“ اربن فش نے ہنس کر کہا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
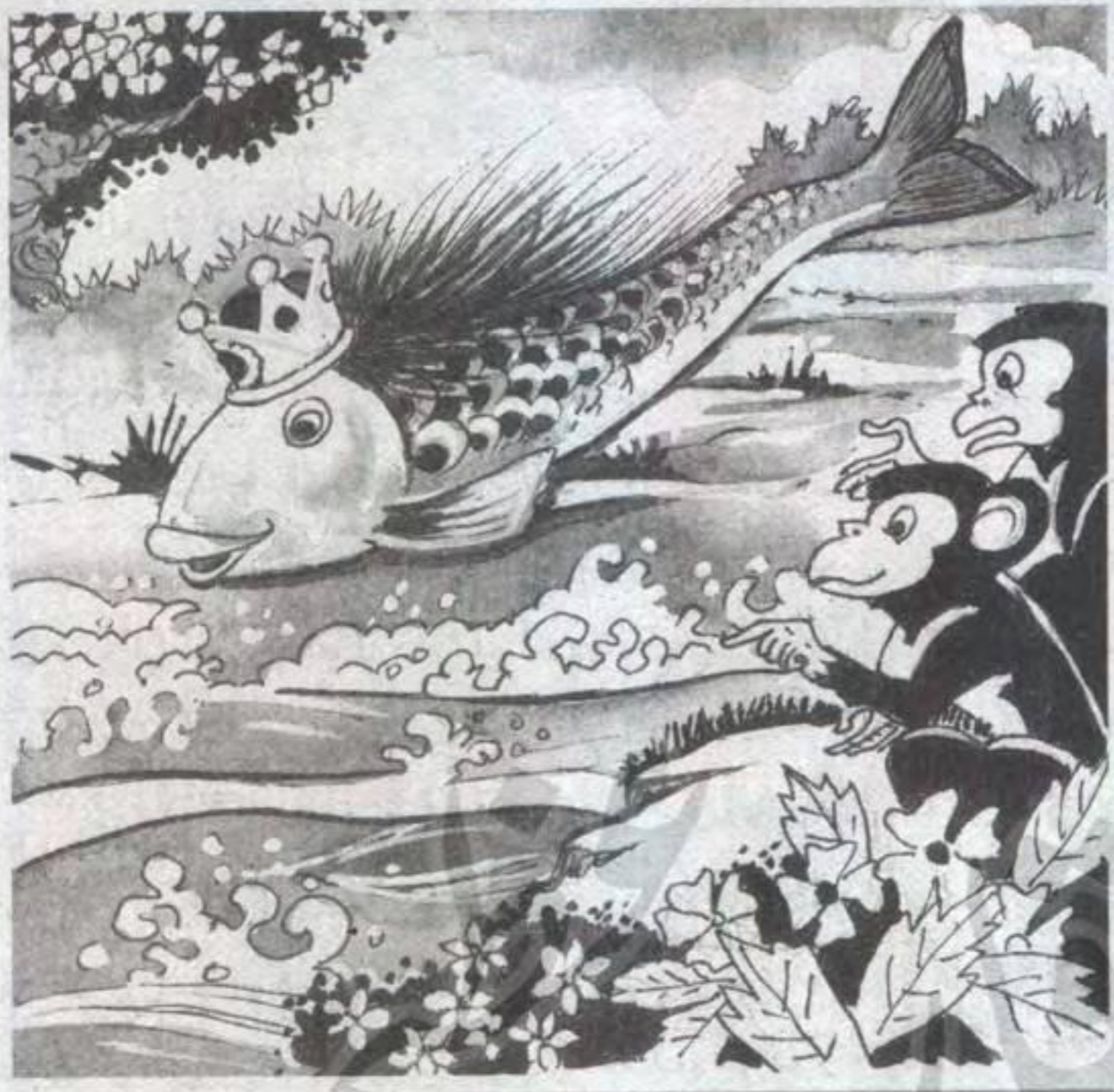
"ہم سے کیا چاہتی ہو؟" مانکی نے کہا۔

"ہم تو اپنے بادشاہ کے بیٹے کو تلاش کرنے نکلے ہیں...... تم نے تو اُسے نہیں دیکھا؟" منکی نے بھولپن سے کہا۔

اربن فش نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولی:

"نادان بندرو! میری بات سنو اور خوب غور سے سنو...... میں اس دریا کی رانی ہوں، میری خوراک اس جنگل کے جانور ہیں...... یوں تو مجھے سارے جانوروں کا گوشت ہی اچھا لگتا ہے، لیکن شیر اور بندر تو خاص طور پر پسند ہیں۔ تمہارے شیر بادشاہ کے بیٹے کو بھی میں نے کھایا تھا اور اب تم دونوں بھی میری خوراک بنو گے...... ہا ہا ہا ہا......" اربن فش نے قہقہہ لگایا اور پھر جھپٹ کر، اس نے دونوں کو گرفت میں لے لیا۔ مانکی اور منکی کی تو جان ہی نکل گئی۔ وہ لگے چیخنے، چلّانے۔ اُن کی چیخ سن کر درختوں پر آرام کرتے ہوئے پرندے گھبرا کر اُڑے۔ اربن فش کہہ رہی تھی:

"واہ! کیا موٹے تازے بندر ہیں...... تمھارا گوشت بہت مزے کا ہوگا۔"

اتنا کہہ کر وہ مانکی کو اپنے غار جیسے دہانے جیسے منہ میں ڈالنے ہی لگی تھی کہ اچانک ایک زوردار آواز گونجی:

"یہ کیا ہو رہا ہے......؟"

دادا جان یہاں تک کہانی سنا کر خاموش ہوگئے۔ بچے پوری توجہ سے کہانی سن رہے تھے، انھیں چپ دیکھ کر جلدی سے بول اُٹھے:

"پھر کیا ہوا دادا جان......؟"

دادا جان نے انھیں کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے انھیں دیکھتے رہے۔ انھیں یوں چپ دیکھ کر بچوں نے بے چینی سے پہلو بدلے۔ ایسے میں تارا کی آواز کمرے میں گونج اٹھی:

"دادا جان! کہیے نا، پھر کیا ہوا...... یہ جملہ کس نے کہا تھا، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ اب بھی کچھ نہ بولے۔ پھر انھوں نے مسکراتے ہوئے تپائی پر پڑے قلم سے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور کاغذ کو تہہ کر کے تپائی کے ایک کونے میں رکھ دیا اور آہستہ سے کہنے لگے:

"پھر کیا ہوا...... میں نے اس کاغذ پر کچھ لکھ دیا ہے، میرے جانے کے بعد اشرف تم لوگوں کو پڑھ کر سنا دے گا...... لو میں چلا......"

دادا جان چہرے پر مسکراہٹ لیے اُٹھے اور کمرے سے نکلتے چلے گئے۔ سارے بچے ان کی اس حرکت پر حیران و پریشان تھے۔ دادا جان نے آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کبھی ادھوری کہانی نہیں سنائی تھی۔ آج انہیں کیا ہوگیا ہے!! وہ سوچ رہے تھے۔ ایسے میں اشرف کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ اس نے تہہ کیا ہوا کاغذ اٹھا کر اُونچی آواز میں پڑھنا شروع کر دیا تھا:

"میں جانتا ہوں، تم لوگوں کو یہ کہانی سن کر مزہ نہیں آیا ہوگا، اس لیے کہ یہ ادھوری ہے...... بالکل اسی طرح جیسے ادھورے تمھارے کام ہوتے ہیں...... ادھورے کام لوگوں کو ادھوری خوشیاں دیتے ہیں...... جس دن تم لوگوں کو پوری خوشیاں دینے لگو گے...... اُس دن میں یہ ادھوری کہانی بھی مکمل کر دوں گا...... اس مزے کی کہانی کا مزہ پورا کر دوں گا، ان شاء اللہ...... میرے عزیز بچو! ادھوری کہانی ہو، کوئی کام ہو یا زندگی...... مزہ نہیں آتا۔"

## اَللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ

(لفظِ ''اللّٰہ'' یہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔)

اَللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ تمام خوبیوں کا مالک ہے اور ہر عیب سے پاک ہے۔

تشریح: ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے پیارے پیارے ننانوے نام بتائے ہیں۔

ان ناموں میں سب سے پہلا مبارک نام ''اَللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ'' ہے۔

قرآن کریم میں یہ نام مبارک 2944 مرتبہ آیا ہے۔

ہم ہر کام کی ابتداء اسی پیارے نام سے کرتے ہیں۔ یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ جو کام اللہ تعالیٰ کا نام لے کر شروع کیا جاتا ہے تو وہ برکت والا ہوتا ہے اور کام کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرماتے ہیں۔

## چرواہے کا امتحان

حضرت عبداللہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک مشہور صحابی ہیں۔ ایک مرتبہ وہ مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے۔ راستے میں کھانے کا وقت ہوگیا۔ دستر خوان بچھایا گیا۔ کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو وہاں سے ایک چرواہا بکریاں چراتا ہوا گزرا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس چرواہے کو کھانے کی دعوت دی۔ اس نے کہا: ''میرا روزہ ہے۔'' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حیران ہوکر اس سے پوچھا: ''اس قدر شدید گرمی میں تم نے روزہ رکھا ہوا ہے؟ اس چرواہے نے جواب دیا: ''میں تو اپنی زندگی کے ان دنوں کو قیمتی بنا رہا ہوں۔'' (یعنی اللہ تعالیٰ کے قیامت کے دن نیک اعمال کا بدلہ نعمتوں کی شکل میں عطا فرمائیں گے)۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس چرواہے سے فرمایا: ''اچھا ایک بکری ہمیں دے دو اور اس کے پیسے لے لو۔ ہم اس کو ذبح کریں گے اور تمہیں بھی گوشت دیں گے۔''

چرواہے نے کہا: ''یہ بکریاں میری نہیں ہیں۔ میرے سردار کی ہیں، میں تو ایک غلام ہوں۔''

تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے امتحان لینے کی غرض سے فرمایا:

''تمہارے سردار کو کیا پتا......؟ اس سے کہہ دینا کہ ایک بکری

کو بھیڑیا کھا گیا۔"

اس غلام نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"اور اللہ تعالیٰ کہاں چلے جائیں گے؟ وہ تو ہر وقت میرے ساتھ ہیں۔"

چرواہے کے جواب پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بہت تعجب ہوا۔ بعد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جب شہر واپس تشریف لائے تو اس چرواہے کے آقا سے وہ غلام اور تمام بکریاں خرید لیں اور غلام کو آزاد کر کے وہ ساری کی ساری بکریاں اسی غلام کو دے دیں۔

## کاغذ کا ایک ٹکڑا

"میرے سر میں درد رہتا ہے، کوئی علاج بتائیں؟" روم کے بادشاہ قیصر نے امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط لکھ کر اپنی تکلیف کا علاج پوچھا۔

خط کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے ایک ٹوپی بھیجی اور فرمایا: "اسے سر پر رکھا کرو، سر کا درد ختم ہو جائے گا۔"

ٹوپی ملنے پر جب قیصر بادشاہ نے اسے پہنا تو اس کا سر کا درد ختم ہو گیا، مگر جیسے ہی اس نے وہ ٹوپی اتاری تو سر کا درد دوبارہ شروع ہو گیا۔ اب جب بادشاہ ٹوپی پہنتا تو سر کا درد صحیح ہو جاتا اور جیسے ہی اتارتا تو سر کا درد شروع ہو جاتا۔

بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا۔ اسے جستجو ہوئی کہ ٹوپی کے اندر سے دیکھوں کہ اس میں آخر کیا ہے کہ ٹوپی پہنتے ہی درد نہیں ہوتا۔ ٹوپی کو چیرا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس میں صرف کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے، جس پر لکھا ہوا ہے۔ "بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم"

قیصر بادشاہ اس بات سے بہت متاثر ہوا اور کہنے لگا:

"اسلام کس قدر عزت والا دین ہے کہ اس کی ایک آیت ہی سے شفا مل گئی تو پورے دین پر عمل کرنا نجات کا ذریعہ کیوں نہ ہو گا!!" پھر بادشاہ نے اسلام قبول کر لیا۔

## پریشانی رفو چکر

آئیے! آج ہم آپ کو ایک ایسا کلمہ بتاتے ہیں جو زندگی بھر آپ کے کام آئے۔ دوسرے دوستوں کو بھی بتایئے، پڑوسیوں کو بھی یاد کروایئے۔ اللہ نہ کرے اگر کبھی پریشانی آ جائے تو بالکل مت گھبرایئے! جیسے امتحان دینے کی پریشانی وغیرہ۔

ایسے موقع پر ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکھایا ہوا یہ کلمہ پڑھ لیا کریں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ پریشانی رفو چکر ہو گی۔

"اَللّٰہُ، اَللّٰہُ رَبِّی لَا اُشرِکُ بِہٖ شَیئًا"

ترجمہ: اللہ، اللہ ہی میرے رب ہیں۔ میں ان کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

## یاد رکھنے کی باتیں

1. ہم ہمیشہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اور ہر ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ اس کا یقین آ جائے گا تو پھر ہم کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ چاہے امی، ابو اور استاد نہ بھی دیکھ رہے ہوں، مگر اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہے ہیں اور اس بات کا یقین آئے گا کیسے......؟ اس بات کا یقین تب آئے گا جب ہم اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کریں گے، کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہماری ہر بات سن رہے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ ہیں۔ آپس میں گفتگو میں ہم اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ضرور تذکرہ کریں۔
2. جب بھی ہم کوئی کام شروع کریں۔ گھر سے باہر نکلیں، بازار جائیں، ہوم ورک شروع کریں کسی کتاب کو پڑھنے لگیں، تو "بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم" پڑھیں۔ اس سے ہمارے کام میں برکت ہو گی اور ہمیں اپنے کاموں میں کامیابی مل جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!
3. ہر کام کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی عادت بنائیں۔ زبان سے کہیں کہ یہ کام اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ مجھے بیماری اللہ تعالیٰ کی طرف ملی ہے اور اسے صحت کی نعمت سے میرے پیارے اللہ تعالیٰ ہی تبدیل کریں گے۔

☆......☆......☆

# بھائی کی پہلی تنخواہ

صفورا نثار

بھائی اسرار نے گیارہویں کا امتحان دیا تھا اور بارہویں کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں مگر وہ کالج صرف پریکٹیکل کے لیے جاتا تھا۔ ان کے کالج میں "پارٹی سسٹم" زیادہ تھا جس کی وجہ سے اکثر و بیشتر ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔

گیارہویں جماعت میں پاپا نے اسے شہر کے سب سے اچھے کوچنگ سینٹر میں داخلہ دلوایا جہاں امیر لوگوں کے بچے پڑھتے تھے۔ اس وجہ سے سب مطمئن تھے کہ اس کے نمبر بھی اچھے آئیں گے۔ بارہویں جماعت میں اس نے پاپا سے کہا کہ وہ کوچنگ سینٹر بہت دُور ہے۔ حالات بھی زیادہ تر خراب رہتے ہیں اس لیے مَیں یہیں کسی اچھے سینٹر میں داخلہ لے لیتا ہوں۔ پہلے تو پاپا نے انکار کر دیا مگر جب حالات کی بات آئی تو وہ مان گئے اور بھائی قریب ہی کوئی اچھا سا سینٹر ڈھونڈنے لگا۔ اچھا کوچنگ سینٹر تو نہیں ملا، البتہ اس کے سر پہ ملازمت کرنے کا بھوت سوار ہو گیا۔ اس نے امی سے کہا کہ وہ پاپا سے اجازت لے دیں، مَیں شام کو کوچنگ سینٹر جاؤں گا اور صبح کو ملازمت کروں گا۔ میرے ساتھ کے باقی لڑکے بھی ملازمت کر رہے ہیں۔ امی نے پہلے تو بہت منع کیا مگر پھر رائم کے بے حد اصرار کرنے پر پاپا سے بات کرنے کے لیے مان گئیں،

لیکن جب انہوں نے پاپا سے بات کی تو پاپا نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ابھی اس کی عمر کیا ہے؟ اگر اس عمر میں اسے پیسے کمانے کا جوش آ گیا تو پڑھائی تو رہ ہی جائے گی۔ جب سب نے مل کر پاپا کو منایا اور کہا کہ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کے بیٹے کو اتنی کم عمری میں ہی اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو گیا ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھنا چاہتا ہے اور یوں اپنے تعلیمی اخراجات بھی خود برداشت کرنا چاہتا ہے تو بلاآخر پاپا مان گئے لیکن اس شرط پر کہ یہ ملازمت نتیجہ آنے کے بعد ہو گی اور زیادہ وقت پڑھائی کو دو گے۔ یہ سن کر بھائی بہت خوش ہوا اور اگلے ہی دن اپنے ملازمت شروع کر دی۔

ارے.... مَیں بھائی کی ملازمت کی خوشی میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ بھائی کی ملازمت تھی کیا؟ وہ کپڑے کی ایک فیکٹری میں جیکٹ تہہ کرنے کا کام تھا۔ اب سنیے ملازمت ملنے کے بعد کی کہانی۔

بھائی کو ملازمت شروع کیے ابھی تین چار دن ہی گزرے تھے کہ حساب ہونا شروع ہو گیا۔ بھائی کو کتنی تنخواہ ملے گی اور اس کا کرنا کیا ہوگا؟

"باجی! پتا ہے، مَیں اپنی پہلی تنخواہ سے اپنے لیے ایک اچھا سا کیمرے والا موبائل فون لوں گا۔" بھائی، باجی کو بتانے لگا۔ پاس

بیٹھی علیشبہ بولی۔ ''بھائی! آپ کو یاد ہے ناں..... آپ نے کہا تھا کہ مَیں تمہیں میٹرک میں اے گریڈ لانے پر اپنی پہلی تنخواہ ملنے پر گفٹ دوں گا؟''

''ہاں! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مَیں اپنی پہلی تنخواہ ملنے پر تمہیں گفٹ ضرور دوں گا۔'' بھائی نے اثبات میں سر ہلایا۔

عیشل اور صائم بولے۔ ''بھائی! ہمیں کیا ملے گا؟''

''تم دونوں فکر مت کرو۔ تمہیں بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔'' بھائی نے تسلی دی۔

''مگر کیا.....؟ یہ تو بتا دیں، بعد میں آپ بولیں گے کہ تم دونوں نے کچھ لانے کو کہا ہی نہیں تھا۔'' آخر بھائی نے ان کو پچاس پچاس روپے دینے کا وعدہ کر کے خوش کر دیا۔

باجی جو کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھیں، حالاں کہ وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی خاموش نہیں رہتی تھیں، آخر بول ہی پڑیں۔

''ارے بھائی! تم مجھے تو بھول ہی گئے۔ میرے تو تم نے بہت سارے پیسے بھی دینے ہیں جو تم مجھ سے ادھار لیتے رہے ہو۔''

''باجی! آپ فکر نہ کریں۔ پہلی تنخواہ ملنے پر مَیں آپ کے بھی سارے پیسے لوٹا دوں گا اور امی کو تو ایک سونے کی انگوٹھی بنوا کے دوں گا۔''

''بھائی! استری خراب ہوگئی ہے۔'' باجی نے کہا تو وہ ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''کوئی بات نہیں..... مَیں اپنی پہلی تنخواہ پہ نئی لا دوں گا۔''

''نئی لانے کو چھوڑو، پرانی ہی ٹھیک کروا دینا۔'' باجی نے کہا۔

''آپ بھی ناں..... نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں۔ اچھا کروا دوں گا ٹھیک یہی والی۔''

ایک دن سب بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ خوب ہنسی مذاق چل رہا تھا کہ اچانک بھائی کا ہاتھ لگنے سے پاس رکھا ہوا کانچ کا گلاس ٹوٹ گیا۔ امی جو دوسرے کمرے میں تھیں، ان کی آواز آئی۔ ''کس نے گلاس توڑ دیا ہے؟'' صائم بولا۔ ''امی! بھائی نے گلاس توڑ دیا ہے۔''

امی کے ڈانٹنے سے پہلے ہی بھائی بولے۔ ''امی! فکر نہ کریں۔ آپ کا یہ بیٹا ہے ناں! اپنی پہلی تنخواہ پہ لا دوں گا، وہ بھی مکمل سیٹ۔''

باجی بولیں۔ ''بھائی! تم سب کے لیے کچھ نہ کچھ لاؤ گے تو کیا شانی کو بھول گئے؟'' (دس سالہ شانی ہمارا سب سے چھوٹا مگر اسپیشل بھائی ہے جو چل پھر نہیں سکتا نہ ہی بول سکتا ہے۔)

''اسے مَیں کیسے بھول سکتا ہوں؟ اس کے لیے تو بہت کچھ لاؤں گا۔ اسے کیلے پسند ہیں، وہ تو لازمی لاؤں گا اور ساتھ میں نئے کپڑے بھی۔'' بھائی نے کہا۔

عیشل بولی۔ ''بھائی! مجھے یہ ٹی وی ٹرالی اور الماری اچھی نہیں لگتی۔ اس کا بھی کچھ کریں ناں!''

''فکر مت کرو، پہلی تنخواہ پہ نئی لے آؤں گا۔'' بھائی نے بے فکری سے کہا۔

غرض اب گھر میں جو بھی چیز خراب ہوتی یا نئی لانے کی بات کی جاتی تو بھائی کا ایک ہی جواب ہوتا۔ ''پہلی تنخواہ پر لے آؤں گا۔'' سب سوچتے کہ آخر بھائی کی تنخواہ کتنی ہوگی جو بھائی سب کچھ پہلی تنخواہ پر لانے کو کہتے ہیں؟ یوں ہی کرتے کرتے پندرہ دن گزر گئے۔

''امی! آج مجھے پہلی تنخواہ ملے گی۔'' بھائی نے صبح جاتے ہوئے اعلان کیا۔

شام کو سب بھائی کے انتظار میں تھے کہ بھائی آ گئے، مگر یہ کیا..... خالی ہاتھ؟ علیشبہ بے صبری سے بولی۔ ''بھائی! میرا گفٹ.....؟''

''وہ کیا ہے..... آج تنخواہ نہیں ملی..... کل ملے گی۔'' بھائی نے مایوسی سے جواب دیا۔

''مگر آپ کو یاد ہے ناں! آپ نے کرنا کیا ہے اپنی پہلی تنخواہ کا؟'' عیشل نے پوچھا تو بھائی نے کہا۔ ''ہاں..... مجھے یاد ہے مگر اب مَیں نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا ہے۔''

''کیا مطلب.....؟'' باجی چیخنے والے انداز میں بولیں۔

''جی باجی! مجھے سب گاؤں بلا رہے ہیں تو مَیں نے سوچا کہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں چلا جاتا ہوں۔ جو تنخواہ ملے گی اس میں سے کیمرے والا موبائل اور گاؤں والوں کے لیے کچھ گفٹ خرید لوں گا۔''

بھائی کی بات سن کر سب چپ ہو گئے۔ باجی بولیں۔ ''چلو ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔''

صائم بولا۔ ''ویسے بھائی آپ کو پہلی تنخواہ کب ملے گی؟''
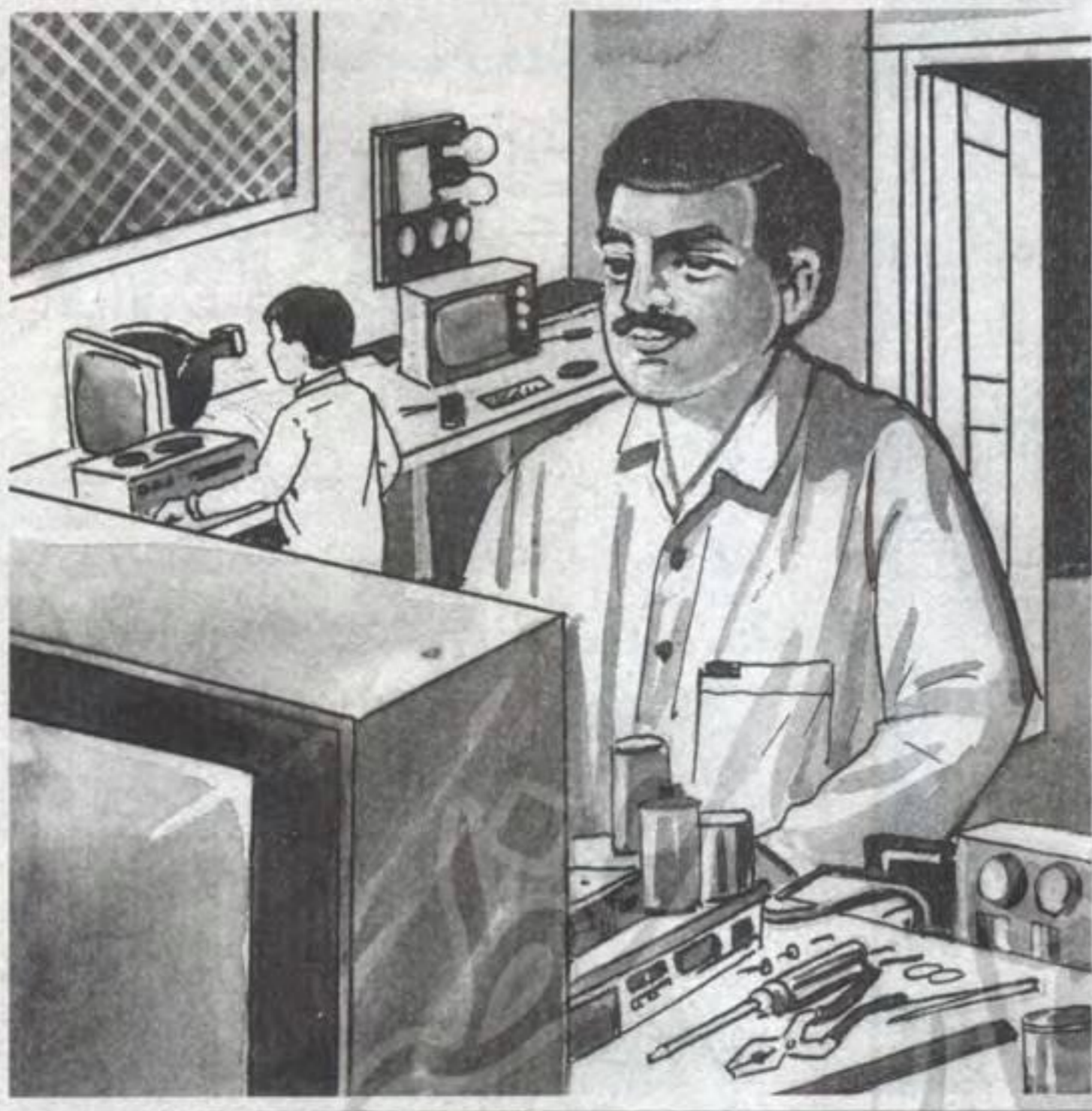
''کل مل جائے گی۔'' بھائی نے کہا۔ پھر ایسے ہی آج کل کرتے کرتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک شام کو جب بھائی گھر آئے تو ان کے ہاتھ میں شانی کے لیے کیلے اور باقی سب کے لیے مٹھائی تھی۔ علیشبہ خوش ہونے والے انداز میں بولی۔ ''بھائی! مل گئی پہلی تنخواہ؟ لائیں میرے پانچ سو روپے۔''

''تمہارے لیے تو مَیں گفٹ لایا ہوں۔ دیکھو، اگر گفٹ اچھا نہ ہوا تو پھر پیسے لے لینا۔'' بھائی نے کہا۔

گفٹ کھولتے ہی علیشبہ کے منہ سے نکلا۔ ''واہ..... بہت پیارا ہے گفٹ، اسے مَیں ہمیشہ اپنے پاس سنبھال کر رکھوں گی۔'' صائم اور عیشل بولے۔ ''بھائی! ہمارے پیسے؟'' بھائی نے کہا۔ ''اس بار تم دونوں دس دس روپے پر گزارہ کرو باقی پھر کبھی۔'' تو وہ دونوں بھی خوش ہو گئے۔

باجی نے پوچھا۔ ''بھائی! ویسے آپ کی تنخواہ ہے کتنی؟''

''2440 روپے۔'' بھائی نے بتایا تو مارے حیرت کے سب کے منہ کھل گئے۔ سب سمجھ رہے تھے کہ بھائی کی تنخواہ بہت زیادہ نہیں تو کم ازکم دس بارہ ہزار تو ہوگی، جو وہ ہر چیز لانے کا بولتے رہتے ہیں۔

''اچھا باجی! یہ سب باتیں چھوڑیں۔'' بس اب مجھے پاپا سے گاؤں جانے کی اجازت لے دیں۔

''کیا بات ہے، تمہیں ایک کے بعد ایک اجازت کی ضرورت پڑ رہی ہے؟ معاف کرنا تمہاری ذمہ داری لینا میرے بس کی بات نہیں۔ پاپا کو تمہارے اچھے نمبر اور محنت چاہیے جو تم سے ہو گی نہیں۔'' باجی نے صاف جواب دیا۔

''نہیں، مَیں محنت کروں گا۔ بس آپ اجازت لے دیں۔ کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے۔''

آخر جب بھائی نے زیادہ ضد کی تو امی اور باجی نے مل کر پاپا سے اسے اجازت لے دی مگر اس شرط پر کہ تم محنت کرو گے۔ بھائی بہت خوش ہوئے اور محنت کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

کچھ دن گاؤں میں رہنے کے بعد جب وہ واپس آئے تو رزلٹ کا انتظار ہونے لگا۔ پاپا کو تو کچھ زیادہ ہی انتظار تھا کیوں کہ ان کی ساری امیدیں جو اس سے وابستہ تھیں۔ سب مطمئن تھے کہ کوچنگ سینٹر اچھا تھا، ٹیسٹ میں بھی نمبر اچھے آتے رہے، محنت بھی کی تھی، امتحان کی تیاری بھی اچھی تھی تو رزلٹ بھی اچھا آئے گا۔

آخرکار وہ دن بھی آ گیا جس کا سب کو انتظار تھا یعنی بھائی کے رزلٹ کا دن۔ سب کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور جب سب نے بھائی کے رزلٹ کا سنا تو کسی کو بھی اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیا ہو گیا؟ کیسے ہوگیا؟ کیوں ہوگیا؟ سب بہت اداس تھے۔ پاپا کی تو جیسے ساری امیدیں ہی ٹوٹ گئی تھیں۔ بھائی ایک دو نہیں پورے چار پیپرز میں فیل تھا۔ اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا ہے؟

سب کا اس سے ایک ہی سوال تھا کہ تم نے آخر پیپر میں کیا کیا تھا جو اتنا خراب رزلٹ آیا ہے؟ بھائی کا ایک ہی جواب.... کہ مَیں نے تو پیپر ٹھیک دیے تھے۔ مجھے نہیں پتا کہ یہ کیا ہوا ہے؟ مَیں پیپر ری چیک کروانے کی درخواست دوں گا۔ اسی اداسی کے عالم

میں باجی نے کہا کہ کیا اپنا رزلٹ تم نے خود دیکھا ہے؟

''نہیں باجی! وہ تو شایان نے نیٹ پہ چیک کر کے بتایا ہے۔''

رائم نے کہا تو باجی بولیں۔ ''بیوقوف! تمھیں پتا ہے ناں، وہ اکثر تم سے اوٹ پٹانگ مذاق کرتا رہتا ہے۔ تم ایک بار خود چیک کر کے تسلی کر لو۔''

''جی آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔'' یہ کہہ کر اسرار اپنا رزلٹ چیک کرنے کے لیے اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی تمام بہن بھائی بھی کمپیوٹر والے کمرے میں پہنچ گئے۔ جب رزلٹ دیکھا تو سب کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ اسرار تمام پیپرز میں پاس تھا مگر یہ خوشی اس وقت ماند پڑ گئی جب باجی نے کہا۔ ''گریڈ تو دیکھو۔'' ''کیا گریڈ؟''

''جی ہاں گریڈ...... نالائق ''سی گریڈ'' بنا ہے تمہارا۔''

اب وہ دوبارہ اداس ہوگیا۔ گھر میں کوئی بھی اداس ہو تو سارے گھر کا ماحول افسردہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے سب نے مل کے اس کی اداسی ختم کرنے کا سوچا اور اسے سمجھایا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا، آگے مزید محنت کر لینا۔ ان شاء اللہ محنت کرو گے تو نمبر بھی اچھے آجائیں گے۔ اور ہاں.....اب ملازمت کے چکر سے بھی نکل آؤ۔

اس کے بعد بھائی نے کچھ زیادہ تو نہیں مگر محنت کی اور بالآخر انٹر پاس کر ہی لیا۔ پھر نوکری کی تلاش میں قسمت آزمائی شروع کردی۔ اخبار میں اشتہار دیکھ کر سی وی جمع کروا دیتا۔ کئی ایک جگہ سے انٹرویو کے لیے بھی بلایا گیا۔ ایک دو جگہ ملازمت ملی بھی مگر کہیں اسے تنخواہ پسند نہ آئی تو کہیں کام کی نوعیت۔ یوں ہی کچھ ماہ گزرے تو ایک گارمنٹس فیکٹری میں کمپیوٹر کا کام مل گیا۔ وہاں کچھ ہی دنوں میں وہ اپنے اچھے کام اور اخلاق کی وجہ سے سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ ہفتے میں ایک دن اتوار کو گھر آتا تو خوب ہلا گلا ہوتا۔ اس کے فیکٹری کے دوست کہتے کہ چھٹی بھی یہیں گزارا کرو کیوں کہ جہاں تمہارا گھر ہے وہاں لوڈشیڈنگ بہت ہوتی ہے۔ تم ٹھیک سے آرام نہیں کر پاتے۔ تو اس کا جواب ہوتا، میں اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارنے جاتا ہوں۔ ان کے ساتھ گزارا ہوا ہر لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ وہی میرا آرام ہے۔ پہلی تنخواہ پر سب سے کیے گئے وعدے بھی بھائی نے بعد کی تنخواہوں سے پورے کیے۔ یہاں اس کی ملازمت اچھی ہونے کے ساتھ ساتھ تنخواہ بھی اچھی تھی مگر اس کی پہلی تنخواہ سب کے لیے یادگار تھی۔

## فرمودات اقبال

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایمان کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا
کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام ونسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں، پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے، اشک پیازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

علامہ اقبال نے یہ اشعار اس وقت کہے جب شاہ عالمی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مندر اور مسجد بنانے پر جھگڑا ہوا۔ مسلمانوں نے ایک رات ہی میں مسجد بنا ڈالی۔ اگلے دن جب علامہ صاحب شاہ عالمی گئے تو اس مسجد میں کوئی بھی نمازی نہ تھا۔

امیر فیصل: شریف مکہ، شریف حسین کا بیٹا جس نے انگریزوں کی حمایت میں ترکوں کی مخالفت کی اور حجاز کا بادشاہ بنا۔

سنوسی: شیخ سنوسی جو سلسلہ سنوسیہ کے شیخ تھے اور طرابلس کے جہادِ آزادی میں پیش پیش تھے۔

اُپدیشک: نصیحت کرنے والا۔

وہ اپنی ہر تنخواہ کے پیسے امی کو لا کر دیتا اور امی انہیں سنبھال کر رکھنے کے لیے باجی کے سپرد کر دیتیں۔ اچھی تنخواہ کے باوجود جب بھائی امی سے پیسے مانگتا تو باجی کہتیں۔ ''اب تو امی سے پیسے مت لیا کرو۔'' وہ کہتا۔ ''امی سے پیسے لینے میں جو مزہ ہے وہ اپنی کمائی کے پیسوں میں کہاں۔ ویسے بھی مجھے امی سے پیسے لے کر احساس ہوتا ہے کہ میں ابھی بچہ ہی ہوں اور میرے پیسوں میں امی کی وجہ سے ہی برکت ہوتی ہے۔''

بھائی نے ملازمت کے ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھی۔ اس کے ساتھ مختلف ٹیکنیکل کام اور ڈپلومہ کورسز بھی جاری رکھے کیوں کہ پاپا کی خواہش تھی کہ میرا بیٹا آفیسر بن کر ملک کی خدمت کرے یا اپنا کوئی کاروبار کرے۔ آخرکار بھائی کی محنت رنگ لائی اور وہ ایک بڑا آفیسر بن گیا۔ محنت اور لگن نے ہماری گھر کی خوشیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ پیارے بچو! محنت کا صلہ تو ملنا ہی ہے! ہے ناں؟

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ کون سا بادشاہ خانہ کعبہ پر حملہ کرنے آیا؟

i۔ سکندر اعظم ii۔ ابراہہ بن اشرام iii۔ نیرو روم

2۔ حج اور عمرے کے دوران استلام بھی کیا جاتا ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟

i۔ چھونا ii۔ بوسہ دینا iii۔ دُور سے سلام کرنا

3۔ حضرت علی ہجویری گنج بخشؒ کا سلسلۂ نسب کس خلیفہ راشد سے جاملتا ہے؟

i۔ حضرت عمرؓ ii۔ حضرت علیؓ iii۔ حضرت عثمانؓ

4۔ کس لفظ کے معنی ہیں ''سب سے پہلے''؟

i۔ پروٹین ii۔ کیلشیم iii۔ وٹامن

5۔ علامہ اقبالؒ کے شعری مجموعہ ارمغانِ حجاز کا کیا مطلب ہے؟

i۔ حجازِ مقدس کا تحفہ ii۔ حجازِ مقدس کی ہوا iii۔ حجازِ مقدس کا پانی

6۔ بیس بال میں گیند پھینکنے والے کھلاڑی کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ سوئنگر ii۔ پچر iii۔ باؤلر

7۔ سر سید احمد خان نے 1877ء میں کس کالج کی بنیاد رکھی؟

i۔ اسلامیہ کالج ii۔ علی گڑھ کالج iii۔ محمڈن کالج

8۔ میسور کی زبان میں ''ٹیپو'' کا کیا مطلب ہے؟

i۔ مجاہد ii۔ شیر iii۔ شہید

9۔ سمندر میں جھاگ کس وجہ سے پیدا ہوتا ہے؟

i۔ معدنیات ii۔ حیوانات iii۔ نمک

10۔ مچھلی کے علاوہ کون سا جانور ہے جسے حلال کیے بغیر کھایا جا سکتا ہے؟

i۔ شتر مرغ ii۔ ٹڈی iii۔ فاختہ

## جوابات علمی آزمائش ستمبر 2013ء

1۔ معراج النبیؐ 2۔ عام الحزن 3۔ مکڑا اور مکھی 4۔ مولانا رومیؒ 5۔ کورٹ 6۔ پطرس بخاری 7۔ ابن الہیثم 8۔ چوہدری خلیق الزماں 9۔ 1892ء 10۔ اصول ارشمیدس

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ عریبہ مقصود، لاہور (150 روپے کی کتب)

☆ زینب ناصر، فیصل آباد (100 روپے کی کتب)

☆ وحیدہ تبسم، سیال کوٹ (90 روپے کی کتب)

**دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:**
سیف اللہ، قصور۔ محمد عرفان اقبال، لاہور۔ عبدالرحمٰن ریاض، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ مناہل نسیم، اسلام آباد۔ رابعہ سلیم راجپوت، راول پنڈی۔ محمد عامر اسلم، لاہور۔ وحیدہ تبسم، سیال کوٹ۔ محمد عبداللہ گل، راول پنڈی۔ مریم صدیقہ، گوجرانوالہ۔ رمنا سعید، گوجرانوالہ۔ عروج ماہین طٰہٰ، سرگودھا۔ عائشہ ندیم، مردان۔ سدرہ انجم، میر پور آزاد کشمیر۔ حامد علی، خوشاب۔ ربیعہ توصیف، ننکانہ۔ زنیرہ جاوید، لاہور۔ عائشہ جنجوعہ، جہلم۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ عروج صادق، واہ کینٹ۔ محمد سعد فیصل، گوجرانوالہ۔ اظہرالدین، کوہاٹ۔ محمد بلال عباس، لاہور۔ انیقہ فجر، میر پور آزاد کشمیر۔ انصر علی، وہاڑی۔ سلیمان علی اعوان، راول پنڈی۔ ھدیٰ مریم، ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد ہاشم اسلم، گوجرانوالہ۔ محمد حنیفہ انوار، جھنگ صدر۔ سلمان طاہر، راہوالی۔ کرن طاہر، لاہور۔ سدرہ ستار، صوابی۔ ولید اشرف، گوجرہ۔ زعیمہ یاسر، لاہور۔ امامہ عالم، راول پنڈی۔ سونیا ذوالفقار خان، مردان۔ منصور اعجاز، بہاول نگر۔ ایمن، ملتان۔ سیدہ آئبہ خلیق الرحمٰن، کراچی۔ زاہد وسیم، بنوں۔ محمد زبیر عبیداللہ، شیخوپورہ۔ عثمان علی، جھنگ صدر۔ محمد ریان طیب، راول پنڈی۔ کشف طاہر، گوجرانوالہ۔ طلحہٰ اعجاز، صوابی۔ ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ۔ ضحیٰ بدر، لاہور۔ احمد نسیم، ایبٹ آباد۔ منا حماد، لاہور۔ محمد انیق اسد، اسلام آباد۔ محمد اسامہ امجد، لاہور۔ امجد جاوید، راول پنڈی۔ کومل صادق چوہدری، گوجرانوالہ۔ عاشر نوید، اوکاڑہ۔ فضہ کیانی، لاہور کینٹ۔ مریم انصاری، حیدر آباد۔ اریبہ ثمرین، لاہور۔ اریبہ رضوان، گوجرانوالہ۔

1- سفید کھیت کالے دانے
بوجھنے والے سیانے

2- پتھر کا دربار
اوپر کھڑا سردار

3- ایک ہے لال سی مانو بلی
وہ جس گھر میں خیر سے جائے
لاکھوں میں پانی پی جائے
اور ساماں سب گھر کا کھائے

4- سر ٹوٹے سل بٹا ٹوٹے
وہ چیز کبھی نہ ٹوٹے

5- نہر کے کنارے دیکھا چیتا
ہر وقت جو ہے پانی پیتا

جب بھر جائے اس کا پیٹ
کمر سے لگ کر جائے لیٹ

6- ایک جانور بہت نرالا
منہ ہے اس کا ہندسوں والا
سارا دن ہے ٹک ٹک کرتا
پھر بھی اس کا منہ نہیں تھکتا

7- میں نے اک طائر کو دیکھا چلتے چلتے تھک گیا
چاقو کے گردن کاٹی، پھر وہ چلنے لگ گیا

8- سامنے آئے کر دے دو
مارا جائے نہ زخمی ہو

9- وہ چیز کہ مانند پری ناز کرے
بے پر کو مارے اور نہ آواز کرے

مس افشاں جیسے ہی کلاس روم میں داخل ہوئیں، تمام طالبات ادب سے کھڑی ہو گئیں۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں خوشی کی چمک، ان کی شخصیت بھی ایسی تھی اور پڑھانے کا انداز اس سے بھی اچھا تھا۔ مشکل سے مشکل بات یوں آسانی سے بیان کر دیتیں کہ فوراً طالبات کے ذہن نشین ہو جاتی۔ ان کا اپنا مضمون تو انگریزی تھا لیکن اکثر لوگ انہیں اسلامیات کی استاد سمجھتے۔ سادہ مگر باوقار لباس اور خوب صورت عادات کے ساتھ وہ پورے سکول میں سب کی پسندیدہ استاد تھیں۔ گستاخ سے گستاخ اور بدتمیز سے بدتمیز لڑکی بھی ان کے سامنے اُف نہ کرتی۔

روزانہ پڑھاتے پڑھاتے اصل سبق کے ساتھ ساتھ باتوں ہی باتوں میں طالبات کو کوئی دوسری اچھی باتیں بھی بتایا کرتیں۔ کسی لڑکی کی غلطی پر اسے یوں مسکرا کر ہلکی سی پیار بھری ڈانٹ پلاتیں کہ اس کی سب کے سامنے بے عزتی بھی نہ ہوتی مگر وہ خود بھی شرم سے پانی پانی ہو کر آئندہ کے لیے اس حرکت سے باز آ جاتی۔

مس افشاں نے اپنا پرس اور رجسٹر میز پر رکھا۔ مسکراتے ہوئے طالبات کے سلام کا جواب دیا اور انہیں بیٹھنے کا کہہ کر خود تختہ سیاہ کی طرف دیکھنے لگیں جس پر خوب صورت تحریر میں لکھا تھا۔

''آج ہم نے پڑھنے کی بجائے مس افشاں سے باتیں کرنی ہیں۔''

مس افشاں کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ''یہ کس کی شرارت ہے بھئی۔'' مگر جواب میں ساری کلاس بس مسکراتی رہی۔ جواب کچھ نہ دیا۔

''بھئی! آپ لوگوں کے سالانہ امتحان قریب ہیں یہ کون سا موسم ہے باتیں کرنے کا؟''

''مس! ہمارا کورس تو کب کا ختم ہو چکا ہے۔ ٹیسٹ لے لے کر آپ نے دہرائی بھی ساری کروا دی ہے۔ چھٹی تو آپ نے کبھی کی نہیں اور نہ ہمیں کرنے دیتی ہیں، اگر ایک دن نہ بھی پڑھیں گے تو خیر ہے۔'' حرا نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ ہی دیا۔

''مس! آج تو کوئی مزے کا واقعہ سنائیں۔'' ماریہ کے کہنے کی دیر تھی کہ پوری کلاس یک زبان ہو گئی۔ ''مس ضرور، ضرور۔ مس پلیز پلیز۔''

''بھئی میرا نام مس افشاں ہے، مس پلیز یا مس ضرور نہیں۔'' مس افشاں کی اس بات پر لڑکیوں کی مسکراہٹیں، قہقہوں میں بدل گئیں۔

''چلیے ٹھیک ہے۔ آج پڑھائی کی بجائے آپ کو ایمان دار تتلی کی کہانی سناتی ہوں مگر شرط یہ ہے کہ آپ سب نے بھی اس تتلی کو ہمیشہ اپنے پاس...... اپنے ساتھ رکھنا ہے۔'' مس افشاں کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئیں اور تمام کلاس پوری طرح متوجہ ہو گئی۔

"کسی شہر میں ایک لڑکی رہا کرتی تھی، پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی، فاطمہ اس کا نام تھا، اس کے ماں باپ، بہن بھائی سب اس سے بہت پیار کرتے۔ وہ تھی بھی بہت اچھی۔ کلاس اوّل سے لے کر اب تک وہ ہمیشہ اوّل درجے میں کام یاب ہوتی رہی۔

پھر یوں ہوا کہ اس کی کلاس میں ایک نئی لڑکی فوزیہ داخل ہوگئی۔ وہ بہت ذہین اور لائق تھی۔ بس جی پھر کیا تھا، ان کا آپس میں خاموش مقابلہ شروع ہوگیا۔ پہلے امتحان میں فاطمہ اوّل رہی جب کہ دوسرے امتحان میں فوزیہ نے اوّل پوزیشن لی۔ اب سالانہ امتحان ہونے والا تھا، فاطمہ سخت پریشان تھی اسے خدشہ تھا کہ کہیں اس دفعہ بھی فوزیہ اس سے آگے نہ نکل جائے۔ وہ محنت بھی کرتی، دعائیں بھی خوب کرتی اور دل ہی دل میں پریشانی بھی اسے لگی رہتی۔ اصل میں حساب کی دو تین مشقیں اسے بہت مشکل لگ رہی تھیں۔ ان کے فارمولے اسے یاد ہی نہ ہوتے تھے۔ اگر ان مشقوں سے ایک دو سوال بھی آگئے تو اس کا کیا بنے گا؟ فوزیہ تو پورے نمبر لے جائے گی اور میں......؟ وہ سخت پریشان ہو جاتی۔

اسی پریشانی میں دن پر دن گزرتے چلے گئے اور امتحان سر پر آ گئے۔ فاطمہ ہر حال میں فرسٹ آنا چاہتی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے تیاری کرے؟

آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا...... ایسا فیصلہ کہ جس پر عمل کرنے کا سوچ کر وہ خود بھی گھبرا گئی تھی مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے دل کو یہ سمجھا کر مطمئن کر لیا کہ آخر دوسری کئی لڑکیاں بھی تو پاس ہونے کے لیے یہی کچھ تو کرتی ہیں۔

صبح حساب کا پرچہ تھا اور اس نے ابھی سے اس فیصلہ پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔ رات دیر تک بستر پہ بیٹھی کتابیں بکھیرے وہ پڑھنے میں مصروف رہی۔ پھر جب سب سو گئے تو اس نے ایک کاغذ پر باریک باریک لکھائی سے تمام مشکل فارمولے اتار لیے اور یہی کام کرتے کرتے نہ جانے وہ کب سو گئی۔

پرچہ شروع ہونے میں آدھ گھنٹا باقی تھا۔ تمام لڑکیاں سرسبز لان میں ادھر ادھر بکھر کر سوالات حل کرنے اور دہرانے میں مصروف تھیں۔ فاطمہ نے دیکھا کہ اچانک ایک بہت خوب صورت تتلی کہیں سے اڑتے اڑتے اس کے قریب آ کر اس کے پنسل بکس پر بیٹھ گئی۔ اس نے آج تک اتنے پیارے پیارے رنگوں والی تتلی نہیں دیکھی تھی۔ فاطمہ اسے بڑی دل چسپی سے دیکھتی رہی، پھر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب تتلی اس سے مخاطب ہوئی۔

"السلام علیکم! اچھی لڑکی!! تم نے اس پنسل بکس میں جو کاغذ لکھ کر رکھے ہیں وہ نکال کر باہر پھینک دو۔" فاطمہ حیرانگی سے بس اسے دیکھتی رہی۔ "کاغذات باہر نکال کر ضائع کر دو اچھی لڑکی!"

اب فاطمہ ذرا سنبھلی اور اعتماد سے بولی۔ "پیاری تتلی! اس

میں میری پنسل، ربڑ اور قلم وغیرہ ہیں۔‘‘

’’میں ان کاغذات کی بات کر رہی ہوں جن پر تم نے فارمولے لکھ کر اس میں چھپائے ہیں۔‘‘ تتلی اب اس کے بازو پہ آ بیٹھی۔

فاطمہ کا دل دھڑک اٹھا۔ بھلا تتلی کو کیسے خبر ہوئی میری اس حرکت کی؟ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

’’دیکھو فاطمہ! میرا نام ایمان دار تتلی ہے۔ جہاں کہیں کوئی بے ایمانی کرتا ہے۔ امانت میں خیانت کرتا ہے، میں کسی نہ کسی شکل میں ایک دفعہ جا کر اسے ضرور سمجھاتی ہوں...... منع کرتی ہوں اگر وہ منع ہو جائے تو میں تمام زندگی اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہوں لیکن وہ مجھے دیکھ نہیں پاتا۔ میں اس کی کام یابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی رہتی ہوں۔‘‘

’’اچھی تتلی! مجھے فوزیہ سے آگے بڑھنا ہے، بس اس دفعہ نقل کروں گی، پھر کبھی یہ کام نہیں کروں گی۔ وعدہ رہا پیاری تتلی۔‘‘ فاطمہ نے التجا کی۔

’’تم یہ وعدہ کبھی بھی پورا نہ کر سکو گی پیاری لڑکی! آج امتحان میں فوزیہ سے مقابلہ ہے، کل کسی اور سے مقابلے کے لیے کیا کچھ نہ کرو گی؟ زندگی بھر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ تو لگی رہتی ہے۔ اگر ایک دفعہ تم نے بے ایمانی کی سیڑھی استعمال کر لی تو پھر ساری عمر تم ایسی سیڑھیاں استعمال کرتی رہو گی۔ نقل کی بجائے محنت کرنی چاہیے۔‘‘ تتلی نے پوری تقریر کر ڈالی۔

’’میں نے بہت محنت کی ہے پیاری تتلی! میں اس سے زیادہ محنت نہیں کر سکتی تھی۔‘‘ اب فاطمہ کا خوف ختم ہو گیا تھا، وہ آرام سے اسے ساری بات بتانے لگی۔ ’’میں اوّل آنا چاہتی تھی، میں فوزیہ کو آگے نہیں بڑھنے دوں گی۔‘‘

’’تم کتنے سال کی ہو پیاری فاطمہ......؟‘‘

’’میری امی جان کو میری عمر کا پتا ہو گا۔ میں تو اپنی سال گرہ نہیں مناتی، اس لیے مجھے معلوم نہیں۔‘‘

’’شاباش! تم ایک اچھی لڑکی ہو اور اچھے بچے سال گرہ نہیں مناتے، البتہ نماز ضرور پڑھتے ہیں اور ہر کام میں اللہ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے مگر میں ابھی نماز سیکھ رہی ہوں، ان شاء اللہ تھوڑے دنوں تک پانچوں نمازیں پڑھا کروں گی مگر فوزیہ سے آگے مجھے آج بڑھنا ہے۔ ابھی پرچہ شروع ہونے والا ہے۔‘‘

’’پیاری دوست! اگر نقل کر کے اوّل آ بھی جاؤ گی تو کیا سچی خوشی مل جائے گی تمہیں؟‘‘ تتلی نے ایک عجیب سوال کر ڈالا۔

’’سچی خوشی؟ ہاں! وہ تو نہ ملے گی۔‘‘ فاطمہ نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ جب سب لوگ میری تعریف کریں گے لیکن مجھے تو اندر سے معلوم ہو گا کہ میں نے بے ایمانی کر کے نمبر لیے ہیں تو پھر ایسے میں خوشی کہاں رہے گی بھلا؟‘‘

’’شاباش فاطمہ! تم بہت پیاری اور سچ بولنے والی لڑکی ہو۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ بھی ہمیشہ سچ بولتے تھے۔ اتنا سچ کہ دشمن تک بھی صادق کہتے تھے۔ وہ امانت دار بھی بہت تھے۔ اتنے زیادہ کہ اپنے بیگانے سب انہیں امین کہتے تھے۔ تم ان کے بارے میں جانتی ہو؟‘‘

’’ہاں! ہاں! وہ ہمارے آخری رسولؐ ہیں، وہ سارے جہان کے لیے رحمت بن کر آئے تھے۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب قرآن پاک نازل کی۔ میری امی جان نے مجھے ان کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہوا ہے۔‘‘

’’پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ آپؐ مکہ سے مدینہ جب ہجرت کرنے لگے تو اہل مکہ کی امانتیں ان کے پاس موجود تھیں۔ انہوں نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلا دیا کہ صبح یہ امانتیں ان کے مالکوں کے حوالے کر کے پھر مدینہ آنا۔ سوچنے کی بات ہے کہ انہوں نے اپنی جان کے دشمنوں سے بھی بے ایمانی نہ کی اور تم...... تم ایک پرچہ کے لیے...... چند نمبروں کے لیے بے ایمانی کرنے پر تیار ہو گئی۔ کتنی بری بات ہے سوچو...... پھر سے سوچو اچھی لڑکی!‘‘

’’مگر فوزیہ......‘‘ فاطمہ اس سے آگے نہ کہہ سکی۔ تتلی کی بات سیدھی اس کے دل میں اتر گئی تھی۔

’’چھوڑو فوزیہ کو، فرسٹ نہ آؤ گی تو کوئی نقصان نہ ہو گا لیکن یاد رکھو، اگر آج بے ایمانی کی راہ پر چل نکلی تو اس میں تمہارا نقصان ہی نقصان ہے۔ سراسر نقصان۔ تمہاری عزت...... تمہاری شخصیت تمہارا کردار سب ختم ہو جائے گا۔ تم محنت کرو...... ورنہ تمہارا کردار ختم ہو جائے گا۔ تم محنت کرو امتحان کے لیے بھی...... اور اپنے کردار کو بنانے کے لیے بھی۔ اللہ پاک تمہاری مدد کرے گا۔‘‘

’’مدد......؟ کس طرح کی مدد......؟‘‘ فاطمہ کی سمجھ میں نہیں آ

رہا تھا۔

"دیکھو! اللہ رب العالمین کی مدد کرنے کے طریقے نرالے ہوتے ہیں، وہ کسی بھی طرح تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے تم آج ایمان داری کی راہ اختیار کرو تو یہ سوال ہی پرچے میں نہ آئیں...... وہ ہر کام کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ بس تم سچے دل سے توبہ کرو اور اسی پر بھروسا کرتے ہوئے اسی سے دعا کیا کرو...... اسی سے مانگا کرو اور بے ایمانی کا خیال تک بھی دل میں نہ لاؤ۔ یاد رکھو بے ایمانی سے کمائے ہوئے رزق میں بھی برکت نہیں ہوتی...... نہ ہی بے ایمانی سے کیے ہوئے کام میں خیر ہوتی ہے اور ہاں! ایک بات تو بتاؤ، تم فوزیہ سے آگے بڑھنا چاہتی ہو یا جنت حاصل کرنا چاہتی ہو؟"

"جنت۔" فاطمہ جھٹ سے بولی۔

"شاباش! تم ایک عقل مند لڑکی ہو۔ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے مزے اور آرام ہیں، جب کہ دنیا کی کام یابی تو عارضی ہوتی ہے۔ مل جائے تو ذرا دیر کے لیے خوشی ہوتی ہے اور اگر نہ بھی ملے تو بھی خیر ہے، وقت گزر ہی جاتا ہے۔ تم نے ٹھیک انتخاب کیا۔ اب میری بات غور سے سنو فاطمہ! اگر جنت حاصل کرنا چاہتی ہو، پھر پیارے نبی ﷺ کے طریقے پر عمل کرنا ہوگا۔ جس طرح انہوں نے اچھے اچھے کام کر کے زندگی گزاری، ہمیں بھی وہی کام کرنا ہوں گے۔ ان ہی کے طریقے پر چلنا ہوگا اور...... اور جن باتوں سے...... جن کاموں سے انہوں نے روکا ہے، ہمیں ان سے رک جانا ہوگا۔ اس طرح کرو گی تو پھر ان شاء اللہ جنت کی حق دار ٹھہرو گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں پیاری تتلی! آج سے بے ایمانی بالکل نہیں کروں گی۔ ہمیشہ سچ بولوں گی۔ امانت اور دیانت کے راستہ پر چلتی رہوں گی اور نیکی کا راستہ بھی جنت کی طرف جاتا ہے۔"

"پیاری لڑکی! لو میں اب چلتی ہوں، اگر کبھی شیطان نے تم سے کوئی غلط کام کروانا چاہا تو مجھے یاد کر لینا...... میری باتیں یاد کر لینا اور...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کو مدد کے لئے پکار لینا...... اچھا! اللہ کی حفظ و امان میں رہو۔" یہ کہہ کر تتلی ایک طرف کو اُڑ گئی۔ فاطمہ کو ایک بات یاد آ گئی جو وہ تتلی سے پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ تتلی کو پکارتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی تو ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ اسی وقت کسی نے آواز دی۔

"فاطمہ بیٹی! اٹھو صبح ہو گئی۔ آج پہلا پرچہ ہے، تھوڑی سی دہرائی کر لو۔"

فاطمہ نے حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا، آنکھیں کھولیں تو سامنے امی جان کھڑی تھیں۔

"آج تو میری بیٹی کتابوں پہ ہی سو گئی تھی۔ اللہ پاک تمہیں اول لائے بچوں میں سے۔" امی نے فاطمہ کا ماتھا چوم کر دل سے دعا دی۔

"اوہ......! تو یہ سب خواب تھا؟" فاطمہ نے حیرت سے سوچا۔ اپنے اردگرد دوبارہ ایک نظر ڈالی اور ایک عزم سے بولی۔

"میں تمہاری باتوں پہ عمل کروں گی ایمان دار تتلی۔" اور پھر اپنے لکھے ہوئے کاغذات پنسل بکس میں سے نکال کر خود ہی پرزے پرزے کر دیے۔

"وہ دن اور آج کا دن...... فاطمہ اپنی زندگی کا سفر نہایت ایمان داری سے طے کرتی آ رہی ہے اور قدم قدم پر مہربان اللہ...... رحمان و رحیم اس کی مدد کرتا رہتا ہے۔ اسے ہمیشہ کام یابی اور عزت ملی ہے۔"

مس افشاں نے مسکراتے ہوئے کہانی ختم کی تو تمام طالبات کے چہروں پر ایک عزم جھلک رہا تھا۔

"مس! کیا یہ سچی کہانی ہے؟" مریم سے نہ رہا گیا۔

مس افشاں نے آہستگی سے ہاں میں سر ہلایا اور بولیں۔

"جی ہاں۔"

"مس! یہ فاطمہ کون ہے؟ کیا آپ اسے جانتی ہیں؟" عائشہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"یہ خود مس افشاں ہی تو ہیں، سمجھا کرو ناں۔ ان کا پورا نام مس افشاں فاطمہ ہے۔"

ماریہ نے اس طرح عائشہ کے کان میں سرگوشی کی کہ ساری کلاس ہی سن لے۔ "آج سے ہم بھی ایمان دار تتلی کی یہ باتیں یاد رکھیں گے۔" ماریہ خود کلاس کی مانیٹر بھی تھی، اس نے گویا سب کی طرف سے ایک عزم کا اظہار کیا۔

"ان شاء اللہ! ان شاء اللہ!" ساری طالبات نے یک زبان ہو کر کہا۔ اتنے میں گھنٹی بج اٹھی اور مس افشاں مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

☆☆☆

# سوال یہ ہے کہ......!

۱۔ شان الحق حقی کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ غلافِ کعبہ کو عربی میں کیا کہتے ہیں؟

۳۔ ہُد ہُد کا ذکر قرآن پاک کی کس سورت میں ہے؟

۴۔ قرآن پاک میں لفظ ''اللہ'' کتنی بار آیا ہے؟

۵۔ بڑھیا نے حضرت عمرؓ سے کتنے دینار کا مطالبہ کیا؟

۶۔ ترکی کا پرچم کس رنگ کا ہے؟

درج بالا سوالوں کے جوابات اکتوبر 2013ء کے شمارے میں موجود ہیں۔ آپ رسالہ غور سے پڑھیے اور اپنے جوابات لکھ بھیجئے۔ درست جواب دینے والے تین خوش نصیبوں کو 300 روپے کی انعامی کتب دی جائیں گی۔ تین سے زیادہ درست حل آنے کی صورت میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جائیں گے۔

**ستمبر 2013ء میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کے نام:**

1-رابعہ سلیم راجپوت، راول پنڈی | 2-عائشہ کریم، ملتان | 3-سنبل ماہین طہٰ، سرگودھا۔

---

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/اکتوبر 2013ء ہے۔

**کھوج لگائیے**

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

---

**آئیے عہد کریں**

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10/اکتوبر 2013ء ہے۔

نام ________ مقام ________

میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ ____________

موبائل نمبر: ____________

---

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10/اکتوبر 2013ء ہے۔

**سوال یہ ہے کہ......!**

نام ________ عمر ________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

---

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/اکتوبر 2013ء ہے۔

**دماغ لڑاؤ**

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

---

اکتوبر کا موضوع ''قائدِ ملت لیاقت علی خان'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08/اکتوبر 2013ء ہے۔

**ہونہار مصور**

نام ________ عمر ________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

---

**میری زندگی کے مقاصد**

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ________ شہر ________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________
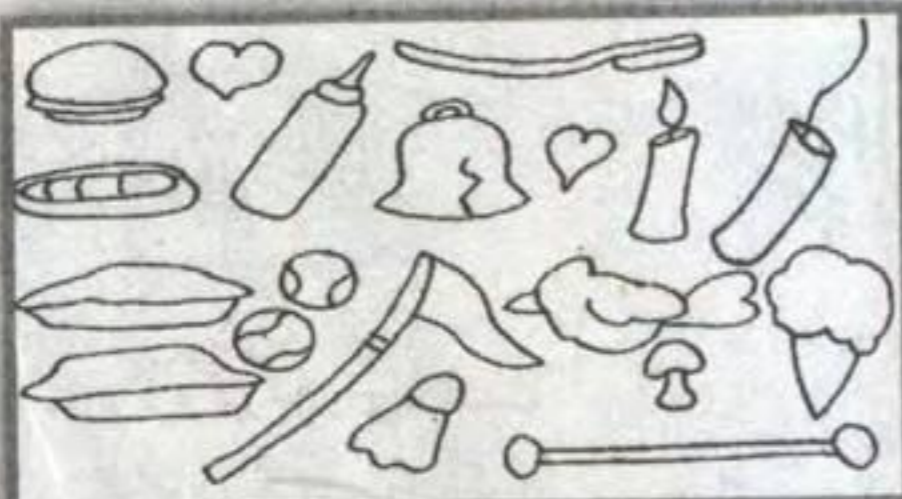
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

4TH OF JULY

©LIZ Ball

ہُدہُد (Wood Pecker) ایک بے حد خوب صورت پرندہ ہے۔ اس کے حسین پر اور لمبی چونچ ہے۔ ہُدہُد کے دو پنجے ہوتے ہیں۔ اس کا سر کدال کی شکل کا، رنگ بادامی اور اس پر کالی اور سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ سر پر لمبی کلغی ہوتی ہے جو کبھی کھڑی اور کبھی دب جاتی ہے۔ کبھی کھل جاتی ہے، کبھی بند ہو جاتی ہے۔ اس وقت دنیا میں ہُدہُد کی دو سو سے زائد قسمیں ہیں۔ ان میں سبز ہُدہُد بہت عام ہے۔

ہُدہُد خوراک کی تلاش میں کیڑے مکوڑے پکڑنے میں بہت ماہر ہے۔ اس کام کے لیے یہ اپنی لمبی، سیدھی، تیز اور طاقت ور چونچ کو کلہاڑی اور چھینی کے طور پر استعمال میں لاتا ہے۔ ہُدہُد کی زبان کیڑے کی طرح لمبی ہوتی ہے۔ ضرورت کے وقت اسے چونچ سے نکال کر خاصی دُور تک پھیلا لیتا ہے۔ زبان کا خاردار سرا کسی تنگ سے تنگ جگہ سے بھی کیڑے مکوڑے پھانسنے میں مدد دیتا ہے۔ کیڑوں کے علاوہ ہُدہُد پھل، پرندوں کے انڈے اور بچے بھی ہڑپ کر جاتا ہے۔

یہ زمین داروں کا بہت بڑا دوست ہے کیوں کہ لیدر جیکٹ اور دوسرے ضرر رساں کیڑوں کو جو زمین کی سطح کے نیچے رہتے ہیں، پکڑ کر کھا جاتا ہے۔

ہُدہُد درختوں کے تنوں میں اپنی تیز چونچ سے سوراخ کر کے گھونسلہ بناتا ہے۔ اسی لیے پہاڑوں، جنگلوں، وادیوں، سبزہ زاروں، چراگاہوں اور ایسی جگہوں پر رہتا ہے جہاں بہ کثرت درخت موجود ہوں۔ گھونسلے میں سوراخ مکمل کرنے میں اسے تقریباً تین ہفتے لگ جاتے ہیں۔ ہُدہُد عموماً درخت میں پہلے کئی سوراخ تراشتا ہے مگر گھونسلہ صرف ایک ہی میں بناتا ہے۔ اس کی عقلِ حیوانی اسے بتا دیتی ہے کہ کون سا سوراخ اس کی توجہ کا مستحق ہے یا نہیں۔ یہ یونہی وقت ضائع نہیں کرتا، لہٰذا کئی سوراخ استعمال کیے بغیر خالی بھی پڑے رہتے ہیں۔ کئی بار ہُدہُد دوسرے ہُدہُدوں کے چھوڑے ہوئے گھونسلوں ہی میں بسیرا کر لیتا ہے۔ بعض ہُدہُد ایک ہی گھونسلہ سال ہا سال بھی استعمال کرتے ہیں۔ باقی پرندوں کے برعکس اس کا گھونسلہ صاف ستھرا نہیں ہوتا۔ ایک وقت میں مادہ ہُدہُد دو سے آٹھ انڈے دیتی ہے، جو عموماً سفید ہوتے ہیں۔ ہُدہُد ننگی لکڑی پر انڈے دیتی ہے۔ یعنی ان کے نیچے گھاس پھوس نہیں

رکھتی۔ نر اور مادہ دونوں باری باری انڈے سینچتے ہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں دونوں برابر کی شرکت کرتے ہیں۔

تین چار ہفتوں کی عمر ہی سے ہُدہُد کے بچے اپنے گھونسلوں کے باہر آنا جانا شروع کر دیتے ہیں مگر پوری طرح خود مختار ہونے کے لیے انہیں مزید دو ہفتے والدین کی نگرانی میں رہنا پڑتا ہے۔ ماں باپ کو خوراک کے لیے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہُدہُد کے ننھے بچے عجیب وغریب آوازیں نکالتے ہیں۔

ہُدہُد ایک محنتی پرندہ ہے۔ صبح 5 بجے سے شام 7:30 بجے تک مصروف رہتا ہے اور 14، 15 گھنٹوں میں دونوں نر اور مادہ کم وبیش 500 کیڑوں کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں۔

ہُدہُد کی قوتِ بصارت بہت تیز ہوتی ہے کہ زمین کے نیچے پانی کو اس طرح لیتا ہے جس طرح شیشے میں کسی چیز کو دیکھتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اس کے ذمہ یہ کام لگایا تھا کہ وہ قافلے کو پانی کی جگہ بتائے کہ کہاں ہے۔

قرآن کریم میں ستائیسویں پارے کی سورۂ نمل کی آیت نمبر 20 میں اس پرندے کا ایک دل چسپ قصہ درج ہے۔

حضرت سلیمانؑ، حضرت داؤدؑ کے فرزند اور بنی اسرائیل کے مشہور اور جلیل القدر پیغمبر تھے جن کو نبوت کے ساتھ ایک عظیم الشان حکومت بھی عطا کی گئی تھی۔

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ وہ چرند و پرند کی بولیاں سمجھ لیتے تھے اور دونوں بزرگوں کے لیے ان کی آوازیں ایک ناطق (بولنے والا) انسان کی گفتگو کی طرح تھیں۔ اس کے علاوہ ہوا، جن وحیوانات ان کے تابع تھے۔

قرآن حکیم میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کے بارے میں جو دلچسپ قصہ بیان ہوا ہے اس میں ہُدہُد نے چٹھی رساں اور رپورٹر کا مرکزی کردار بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

ایک روز حضرت سلیمانؑ اپنی فوج کے جانوروں والے شعبے کا معائنہ کر رہے تھے۔ پرندوں کا جائزہ لیا تو ہُدہُد کو نہ پایا۔ ہُدہُد کی بلا اطلاع غیر حاضری پر انہوں نے کہا:

کیا وجہ ہے میں ہُدہُد کو نہیں پاتا، کیا واقعی وہ غائب ہے؟ ایسا ہے تو ضرور اس کو سخت عذاب میں ڈالوں گا یا ضرور ذبح کروں گا یا وہ میرے پاس غیر حاضری کی معقول وجہ بیان کرے۔ بہت دیر نہیں لگی کہ ہُدہُد نے حاضر ہو کر کہا: میں ایسی خبر لایا ہوں جس کا آپ کو پہلے علم نہیں تھا۔ میں سبا کی ایک یقینی خبر لایا ہوں۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے جو اہلِ سبا پر حکومت کرتی ہے اور اس کے پاس سب کچھ مہیا ہے۔ ایک عظیم الشان تخت اس کے پاس ہے۔ وہ اور اس کی قوم آفتاب کی پوجا کرتی ہے۔ سلیمانؑ نے کہا: ہم اب دیکھتے ہیں کہ تو اپنے قول میں سچا ہے یا جھوٹا، لے جا میرا خط اور ان کی طرف ڈال دے۔ ہُدہُد یہ خط اپنی چونچ میں تھامے ہوئے پرواز کرنے لگا۔ سبا پہنچ کر اس نے حضرت سلیمانؑ کا خط ملکہ کے حوالے کیا اور خود واپس لوٹ آیا۔

## ہائے گرمی

سب کی زباں پر ایک ہی نعرہ ہائے گرمی ہائے گرمی
گرمی سے ہیں سارے پریشان کہیں بھی چین نہ آئے
بچے بالے تالابوں میں جا کر خوب نہائیں
کبھی اُچھالیں ہاتھ سے پانی کبھی وہ ڈبکی کھائیں
سارے پرندے پیاس کی شدت سے ہیں ہانپتے کیسے
دھوپ ہی دھوپ ہے چھائی ہر سو سایہ ڈھونڈتے پھرتے
سڑکوں پر بھی کم ہے ٹریفک گرمی ہے کچھ اتنی
جس پسینے سے ہیں بھیگے بُری ہے حالت سب کی
میدان سب ویران پڑے ہیں گھروں میں ہیں سب بچے
ماما نے حمزہ کو ڈانٹا جانا نہ باہر گھر سے
چائے کا اب دور گیا ہے لسی کے دن آئے
کوئی کھائے برف کے گولے کوئی قلفی کھائے
منے چھوٹی کا فالودہ کھا گئے چھین کے سارا
اس حرکت پر دادا جی نے زور پھر للکارا
کبھی نہ لڑنا کھانے پینے پر تم دیکھو منے
مل جل کر کھاتے ہیں جو بھی چیز ہو اچھے بچے
پانی جلدی جلدی پینا ہے ضیا کا کہنا
اچھا نہیں ہے دھوپ میں دیکھو گھر سے باہر رہنا

(ضیاء الحسن ضیا)

# معلوماتِ عامہ

- قرآن پاک کی پہلی وحی کے بعد دوسری وحی تین سال بعد آئی۔
- قرآن پاک میں "م" وقف لازم کی علامت کے لیے ہے۔
- واقعۂ معراج سورۃ بنی اسرائیل کے علاوہ سورۃ نجم میں بیان ہوا ہے۔
- سید جمال الدین افغانی کی کوششوں سے قرآن کا ترجمہ روسی زبان میں ہوا۔
- سورۃ بقرہ میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا ذکر ہے۔
- ہیموگلوبن صحت مند نوجوان میں تقریباً 15 اونس ہوتی ہے۔
- چینی کا کیمیائی فارمولا $C_{12}H_{22}O_{11}$ ہے۔
- گنجے پن کی بیماری وٹامن H کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

(اقراء بشیر، ملتان)

- اقوام متحدہ کے مالیاسی امور کی نگرانی دی اکنامک سوشل کرتا ہے۔
- راڈار سب سے پہلے جنگ عظیم دوم میں استعمال کیا گیا۔
- آغا اوّل کا اصل نام حسن علی شاہ تھا۔
- وہ عمارت جہاں فوجی رہتے ہیں، اصطلاح میں بیرک کہلاتی ہے۔
- بنگال کی مشہور شخصیت مولوی فضل حق کو شیرِ بنگال کے نام سے پکارا گیا۔
- اسلامی تقویم کا شمار سال ہجرت سے ہوتا ہے۔
- کوفی کا پھل پھلیوں کی صورت میں لگتا ہے۔
- کن کھجورے کے جسم کے اگلے دو پنجوں میں زہر ہوتا ہے۔

(فیصل اکرام، کراچی)

- سانپ کے انڈوں کا رنگ سفید یا کریم کلر ہوتا ہے۔
- توریت کا عبرانی زبان میں مطلب قانون ہے۔
- پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز (PIA) کا قیام 1954ء کو عمل میں آیا۔
- مصر کے صدر انور سادات کو 6 اکتوبر 1981ء کو قتل کیا گیا۔
- 1916ء میں سوویت یونین نے آرمینیا پر قبضہ کیا۔
- جنوبی افریقہ نے 31 مئی 1910ء کو برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔
- پاکستان میں پہلی مردم شماری کا آغاز 9 فروری 1951ء میں ہوا۔
- پاکستان میں کل چار گورنر جنرل بنے۔

(ذوالقرنین حیدر، پشاور)

- جسٹس ریٹائرڈ محمد رفیق تارڑ پاکستان کے 9 ویں صدر تھے۔
- پاکستان کی سب سے اونچی سطح مرتفع پامیر کی ہے۔
- راول بند دریائے گورنک پر باندھا گیا ہے۔
- وادیٔ کشمیر میں سب سے بڑی وولر جھیل ہے۔
- پاکستان کے چھانگا مانگا کے جنگل میں مہتاب جھیل ہے۔
- صوبہ پنجاب کا کل رقبہ 205344 مربع کلومیٹر ہے۔
- پاکستان نے 1952ء میں سلامتی کونسل کی رکنیت اختیار کی۔
- پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل 1922ء کو جرمنی میں پیدا ہوئیں۔
- علامہ اقبال نے 1932ء میں مشہور مسجد قرطبہ میں حاضری دی۔

(شیزہ عمران، راول پنڈی)

- پی ٹی وی کا مقبول ترین سلسلہ "الف اور نون" مصنف کمال احمد رضوی کا تحریر کردہ ہے۔
- سید عبداللطیف بھٹائی کے والد کا نام سید حبیب تھا۔
- دنیا میں سب سے پہلے ملک یونان کی تاریخ لکھی گئی۔
- سکندر اعظم نے 332 قبل مسیح میں مصر فتح کیا تھا۔
- گوتم بدھ کی پیدائش 550 قبل مسیح میں ہوئی تھی۔
- پاکستان کا سب سے اعلیٰ ترین فوجی اعزاز نشان حیدر ہے۔
- دنیا کی سب سے بڑی خونی جنگ، جنگ عظیم دوم تھی۔
- صدام حسین کی گرفتاری کے لیے خصوصی آپریشن کو ریڈ ڈان کا نام دیا گیا تھا۔
- ابراہام لنکن 1865ء میں امریکہ کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

(قاسم جلال، گجرات)

# میری زندگی کے مقاصد

**ارسل نصیر، فیصل آباد**

میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔

**عائشہ ندیم، مردان**

میں آرمی میں ڈاکٹر بن کر والدین کا نام روشن کروں گی۔

**حسنین رفیق، ٹیکسلا**

میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کروں گا۔

**محمد فائق شہزاد، سرائے عالم گیر**

میں ایئر فورس جوائن کر کے ملک کی حفاظت کروں گا۔

**عائزہ مقصود، ٹوکیو، جاپان**

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور ملک کی خدمت کروں گی۔

**فہد مصطفیٰ، جام پور**

میں انجینئر بن کر ملک کا نام روشن کروں گا۔

**اسید بن وقاص، ملتان**

میں پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنوں گا اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

**علشبہ، راول پنڈی**

میں بڑی ہو کر لیکچرار بنوں گی اور تعلیم کی روشنی پھیلاؤں گی۔

**فارحہ عمر، لاہور**

میں بڑی ہو کر استانی بنوں گی اور غریب بچوں کو مفت تعلیم دوں گی۔

**محسن علی رضا، لاہور**

میں الیکٹریکل انجینئر بن کر بجلی کا بحران دور کروں گا۔

**سوہا عدیل، لاہور**

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

**احمد مجتبیٰ، اسلام آباد**

میں پائلٹ بنوں گا اور لوگوں کو دُنیا کی سیر کراؤں گا۔

**محمد جنید مغل، راول پنڈی**

میں پاک ایئر فورس میں پائلٹ بنوں گا۔

**نعمان شہباز، گوجرانوالہ**

میں سیاست دان بنوں گا اور ملک و قوم کی رہنمائی کروں گا۔

**علینہ رحمٰن، راول پنڈی**

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کروں گی۔

**جنید بشیر، راہوالی**

میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

**عبدالرحمٰن، سمندری**

میں حافظِ قرآن بنوں گا اور باعمل عالم بنوں گا۔

**محمد شایان، راول پنڈی**

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

**حافظ محمد الیاس خان، لاہور**

میں حافظ قرآن بنوں گا اور دین اسلام کی روشنی پوری دُنیا میں پھیلاؤں گا۔

**صباحت مصطفیٰ، لاہور**

میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔

**محمد ولی، فیصل آباد**

میں فوج میں افسر بن کر اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔

**محمد عمر، اسلام آباد**

میں انجینئر بنوں گا اور اپنے والدین اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

**امیر حمزہ فاروقی، اسلام آباد**

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔

**حافظہ نمرہ، فیصل آباد**

میں بڑی ہو کر دین اسلام کی خدمت کروں گی۔

**محمد بلال عباس، لاہور**

میں ڈاکٹر بنوں گا اور لوگوں اور اپنے والدین کی خدمت کروں گا۔

## بکرا

ہمارے ملک میں عیدالاضحیٰ پر سب سے زیادہ قربان ہونے والا جانور بکرا (Goat) ہے۔ بکرے کا سائنسی نام "CAPRA AEGAGRUS HIRCUS" ہے۔ اس کا خاندان "BOVIDAE" اور کلاس ممالیہ ہے۔ بکروں کی 300 سے زائد اقسام ہیں جنھیں عرصہ دراز سے بحیثیت پالتو جانور لیا جاتا ہے کیوں کہ انہیں دودھ، گوشت اور کھال حاصل کرنے کے لیے تجارتی حیثیت حاصل ہے۔ مادہ بکری کو "NANNIES" اور نر بکرے کو "BUCKS" یا "BILLIES" اور بکرے کے بچے کو "KIDS" کہا

جاتا ہے۔ خیال ہے کہ یہ جانور لگ بھگ 10 ہزار سال سے پالا جا رہا ہے۔ بکرے کے دو سینگ ہوتے ہیں، جو زندہ ہڈیوں کے بنے ہوتے ہیں جن میں "KERATIN" پروٹین پائی جاتی ہے۔ ان کے معدے میں چار خانے ہوتے ہیں۔ نر اور مادہ دونوں کی چھوٹی سی ڈاڑھی بھی ہوتی ہے۔ دو سے تین سال کے لگ بھگ بکرا جوان ہو جاتا ہے۔

یہ دودھ پلانے والا جانور ہے۔ بکری روزانہ 6 پاؤنڈ تک دودھ دے سکتی ہے۔ یہ ریوڑ کی صورت میں رہتے ہیں اور گھاس پتے کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ ایک صحت مند جانور 15 سے 18 برس تک زندہ رہ سکتا ہے۔ دُنیا میں سب سے زیادہ بکرے اور بکریاں براعظم افریقہ میں ہوتے ہیں۔ بکریوں کا سب سے زیادہ دودھ بھارت میں پیدا ہوتا ہے۔ تاہم دُنیا میں کل دودھ کی پیداوار کا صرف 2 فی صد بکریوں سے حاصل ہوتا ہے۔ بکرے کے گوشت میں چکنائی اور پروٹین پائی جاتی ہے جب کہ دودھ میں نمکیات کے علاوہ کیلشیم اور کولیسٹرول بھی ہوتا ہے۔

## ترکی کا پرچم

برادر اسلامی ملک ترکی کا قومی پرچم (NATIONAL FLAG) 1844ء سے دُنیا بھر میں ترکی کی پہچان ہے۔ یہ پرچم سرخ رنگ کا ہے جس پر سفید رنگ کا چاند ستارہ موجود ہے جو درمیان سے ذرا بائیں جانب ہے۔ ستارہ 5 کونوں پر مشتمل ہے۔ یہ چاند ستارہ ترکوں کی تاریخ کے جانبازوں کی عظمت کا ترجمان ہے۔ 29 مئی

1936ء میں ترکی نے اپنے قومی پرچم کے خدوخال کے یقین کے لیے قانون سازی کی۔ 1844ء سے قبل پرچم پہ 8 کونوں والا ستارہ ہوا کرتا تھا۔ موجودہ چاند ستارہ دینِ اسلام کی عکاسی کرتے ہیں۔ پرچم میں سفید رنگ امن و دیانت داری کی علامت ہے۔ ترکی زبان میں اس پرچم کو "AY YILDIZ" کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے ”چاند ستارہ“۔ قومی مواقع پر پرچم ترانے کے ساتھ لہرایا جاتا ہے۔ یہ قومی ترانہ 12 مارچ 1921ء سے بجنا شروع ہوا۔ ترکی کی تاریخ بڑی قدیم ہے۔ موجودہ ترکی نے 29 اکتوبر 1923ء سے یومِ آزادی منانا شروع کر رکھا ہے۔

## لپ اسٹک

لپ اسٹک (LIPSTICK) کا شمار کاسمیٹکس میں ہوتا ہے جس میں پگمنٹ، آئل، موم (WAX) اور نمی رکھنے والے پیچیدہ مرکبات شامل کیے جاتے ہیں۔ نمی رکھنے والے مرکبات کو "EMOLLIENTS" یا موئسچرائزر کہا جاتا ہے۔ لپ اسٹک ہونٹوں کو جاذبِ نظر، خوب صورت بنانے اور رنگنے کے کام آتی ہے۔ اس کے بغیر میک اپ نامکمل سمجھا جاتا ہے۔ لپ اسٹک کے مختلف رنگ پگمنٹ کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ خیال ہے کہ لپ اسٹک کا استعمال خواتین تین ہزار سال سے کر رہی ہیں اور عرب کے کسی علاقے سے اس کا استعمال شروع ہوا۔ تاہم ابتداء میں پودوں سے DYES

حاصل کر کے ہونٹ رنگنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مقصد چہرے کی خوب صورتی میں اضافہ کرنا تھا۔ مسلم سائنس دان ابو القاسم ابو الزاہروی نے پہلی بار خوشبو دار لپ اسٹک تیار کی۔ جدید لپ اسٹک نے 16 ویں صدی میں مقبولیت حاصل کرنا شروع کی۔ ابتداء میں صرف سرخ رنگ کی لپ اسٹک بننی شروع ہوئی۔ اس وقت شہد کے چھتے سے حاصل ہونے والا موم اور درخت سے حاصل شدہ سرخ "DYE" اس کی تیاری میں استعمال ہوتے تھے۔ 19 ویں صدی میں "GUERLAIN" نامی فرانسیسی کاسمیٹکس کمپنی نے لپ اسٹک متعارف کروائی۔ یہ 1884ء کا زمانہ تھا۔ اس میں پہلی بار CASTOR OIL بھی شامل کر لیا گیا۔ 1915ء میں لپ اسٹک کو پہلی بار موجودہ شکل میں پیک کر کے مارکیٹ میں لایا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دھاتی ٹیوب کی بجائے لپ اسٹک کو پلاسٹک سلنڈرز میں متعارف کروایا گیا۔ اب اس میں پٹرولیم بھی شامل کر دیا گیا۔ 1940ء میں دیر تک رہنے والی لپ اسٹک تیار کر لی گئی۔ آج کل یہ جدید پیکنگ اور متعدد رنگوں میں دستیاب ہیں۔

## بادام

بادام (ALMOND) ایک مفید پھل ہے جو بطور میوہ کھایا جاتا ہے۔ اس کا تعلق گلاب کے خاندان سے ہے۔ اس کا سائنسی نام "PRUNUS AMYGDALUS" ہے۔ یہ درمیانے سائز کا درخت مڈل ایسٹ اور جنوبی ایشیاء سے تعلق رکھتا ہے۔ تکنیکی اعتبار سے بادام کا پھل ایک "DRUPE" ہے۔ بادام کی گری پہ سخت چھلکا ہوتا ہے جسے توڑ کر بیج کو کھایا جاتا ہے۔ اس کا درخت 4 سے 10 میٹر بلند ہوتا ہے جب کہ تنے کی موٹائی 12 انچ ہوتی ہے۔ پتے 3 سے 5 انچ لمبے ہوتے ہیں جب کہ پتے کی ڈنڈی

(PETIOLE) 2.5 سینٹی میٹر لمبی ہوتی ہے۔ پھول سفید یا ہلکے گلابی رنگت کے ہوتے ہیں جن کا قطر 3 سے 5 سینٹی میٹر ہوتا ہے۔ بادام کی پیداوار تین سال کی عمر کے درخت سے شروع ہوتی ہے۔ بادام خزاں میں تیار ہوتے ہیں۔ بادام کا پھل 3.5 سے 6 سینٹی میٹر لمبا ہو سکتا ہے۔ گری کو NUT کہا جاتا ہے۔ بادام سے تیل بھی حاصل ہوتا ہے۔ انسان یہ پھل 3000 سال قبل مسیح سے اگا رہا ہے۔ امریکہ، اسپین، ایران، مراکو، شام، افغانستان، ترکی، تیونس اور الجیریا دُنیا میں بادام پیدا کرنے والے بڑے ممالک ہیں۔ بادام کاربوہائیڈریٹس، چکنائی، پروٹین، وٹامن E,K,B,A، کیلشیم، آئرن، میگنیشیم، مینگنیز، فاسفورس، سوڈیم اور زنک کا خزانہ ہے۔

| | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| د | ن | ظ | ت | گ | ل | ط | ب | ا | ج |
| ا | ش | ف | ڈ | ا | ک | ب | ر | ف | ب |
| م | ق | ر | ٹ | ذ | ص | ے | م | س | ل |
| ن | ء | ش | ی | ہ | ط | خ | ڈ | ق | ا |
| ث | ع | ل | ا | ب | ق | ا | ض | ح | غ |
| ف | ش | ڈ | غ | ض | م | گ | ج | ا | س |
| ی | پ | ز | ف | ر | ا | ز | م | ف | ر |
| ض | ر | ش | چ | ی | ح | ک | و | ی | خ |
| د | ب | ل | ا | ج | ر | ن | م | ظ | ا |
| ل | ظ | ج | ش | و | ع | ت | ن | ڈ | ب |

پیارے بچو! اُردو ادب کے شعراء کے تخلص دیے گئے ہیں۔ آپ نے حروف ملا کر ان شعراء کے تخلص تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن دس تخلص کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

اقبال، غالب، اکبر، ظفر، فیض، مومن، فراز، جالب، حفیظ، دامن

"ارے ارے رکو بھائی ....!" وہ اچانک ہی چیخ کر بھاگا تھا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔" اس نے سڑک پر ایک دم شور مچانا شروع کر دیا۔ چند افراد اس کی جانب دیکھنے لگے۔ سڑک پر عجیب منظر تھا۔ آگے ایک شخص سائیکل چلا کر بھاگ رہا تھا اور اس کے پیچھے ایک لمبا تڑنگا نوجوان بھاگ رہا تھا۔ لوگ سمجھ نہیں پائے تھے کہ ہوا کیا ہے؟

"تم اتنی آسانی سے میری سائیکل لے کر نہیں جا سکتے......" اس لمبے نوجوان نے دوڑتے ہوئے کہا۔ وہ لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ سائیکل لے کر دوڑنے والا آدمی پریشانی کا شکار تھا۔ لمبے نوجوان کی اسپیڈ بتا رہی تھی کہ وہ اسے پکڑ لے گا اور ہوا بھی یہی، اس نے سائیکل سوار کو جھپٹ کر گرا دیا۔ وہ سائیکل سے الگ ہو کر دُور گرا۔ نوجوان نے سائیکل اٹھانے میں دیر نہیں لگائی اور یہ وہ موقع تھا جب سائیکل چور نے کچے کے علاقے میں اُتر کر بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ اگر وہ وہاں رکا رہتا تو مار پڑنے اور پھر پکڑے جانے کا قوی امکان تھا۔ لمبے نوجوان نے اسے بھاگتا دیکھ کر پہلے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا، کچھ سوچا اور پھر سائیکل تھام کر سڑک کی دوسری جانب چل دیا۔ اپنی سائیکل اسے مل چکی تھی، اب بھاگنا بے سود تھا۔

ہاں تو ساتھیو! اب آپ کو یہ پتا تو چلنا چاہیے کہ یہ نوجوان کون تھا اور ایسا کیا کر رہا تھا کہ اس کی سائیکل پر چور کی رال ٹپک پڑی۔ یہ نوجوان (جس کے کئی نام تھے جو اس کے قصے آپ تک پہنچنے کے ساتھ ساتھ آپ جانتے رہیں گے۔) ابن پودینہ کا لے پالک بیٹا تھا۔ یہ وہی ابن پودینہ ہیں جن کی کہانیاں آپ کے امی ابو پڑھ کر محظوظ ہوتے رہے تھے اور اب آپ ان کے بیٹے کے کارنامے پڑھ کر خوش ہوا کریں گے۔ ابن پودینہ کو جس طرح جاسوسی کا جنون کی حد تک شوق تھا، بالکل اسی طرح ان کے اس بیٹے میں بھی یہ جراثیم بھر پور انداز میں موجود تھے۔ ابن پودینہ تو پرانے زمانے کے بزرگ تھے اس لیے وہ پرانے طریقوں سے جاسوسی کیا کرتے تھے لیکن ان کا یہ بیٹا جو ماموں وائی فائی کے نام سے مشہور تھا، جدید طریقوں سے اپنے جاسوسی کے شوق کو پروان چڑھانے میں مصروف تھا۔ اب اس میں اسے کس حد تک کامیابی ہو رہی تھی، یہ دعویٰ تو ہم نہیں کریں گے کیوں کہ یہ ساری باتیں تو آپ ماموں وائی فائی کے کارناموں میں پڑھ سکیں گے۔ اسی طرح آپ کو مزا بھی آئے گا۔

اب یہ بات بھی ہو جائے کہ ماموں وائی فائی کا یہ نام کس طرح سے پڑا۔ ماموں کے پاس ایک عدد موبائل تھا اور وہ بھی جدید۔ اب یہ موبائل ان کے پاس کیسے آیا، یہ بھی ایک الگ داستان ہے جو کسی قصے میں ضرور بتائیں گے۔ ہاں تو موبائل ان کے پاس تھا لیکن نہ بیلنس کے لیے ان کے پاس رقم ہوتی تھی اور نہ ہی نیٹ چلانے کے لیے کوئی خرچہ تھا لیکن یہ ماموں تھے بڑے چالاک۔ ان کو یہ پتا تھا کہ بڑے بڑے ہوٹلوں اور رہائشی پلازاؤں میں انٹرنیٹ کا وائی فائی نظام منسلک ہے اور وہ اکثر اپنے گاہکوں کی سہولت کے لیے کوڈ بھی خفیہ نہیں رکھتے، اس لیے ماموں نے ایسے ہوٹلوں کے اطراف میں چکر لگا کر اس سسٹم سے مفت بھرپور فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ان کی اس حرکت کو لوگوں نے دیکھ لیا تھا اور من چلے لڑکے تو ان کی اس مفت خور سروس پر خوب ہنسی مذاق کرتے تھے۔ اسی ہنسی مذاق میں ان کا نام ماموں وائی فائی پڑ چکا تھا۔ اب یہ کہاں کہاں کالیں کرتے تھے اور جاسوسی میں کس طرح وائی فائی کے رول کو مفید بناتے تھے، یہ آپ کو پتا چلتا رہے گا۔

اس بار تو ماموں کچھ عجیب موڈ میں تھے۔ اس ماہ ان کا جاسوسی کا کوئی ارادہ نہیں تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بقرعید قریب تھی اور وہ اس کے لیے اپنے آپ کو مصروف کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ بقرعید کا لفظ سن کر بچے تو کیا بڑے بھی یہی کہتے ہیں کہ چوں کہ اس عید پر بکرے خوب کٹتے ہیں اس لیے یہ بکرا عید ہے جب کہ بقر عربی کا لفظ ہے اور عربی میں بقر گائے کو کہتے ہیں، ہے نا عجیب بات۔ اس عید پر بکرے، دنبے، بھیڑیں، گائے اور اونٹ تک ذبح کیے جاتے ہیں۔

ہاں تو ہم تو بتا رہے تھے جاسوس ماموں کا اس عید کا پروگرام۔ جس طرح ان کے والد بزرگ وار کوئی نوکری یا کاروبار نہیں کر سکے تھے، اُن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ بھی کچھ نہ کر سکا تھا۔ باپ کو جب بھوک لگتی اور گھر میں کچھ نہ ہوتا اور کوئی اُدھار دینے پر بھی تیار نہ ہوتا تو ابن پودینہ، وائی فائی کو خوب سناتے اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ اس بار ان کے اندر غیرت جاگ گئی تھی اور وہ اس عید پر روزی کمانے کے بارے میں سنجیدہ تھے۔

بھلا ہو خیر دین قصائی کا کہ اس نے ماموں کو اپنی مدد کرانے کے لیے ہر کیس میں ساتھ لے جانے اور ہر ملنے والی جمع پونجی سے بیس فی صد حصہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، اسی کے مصداق ماموں کو چاہئیں تھی دو روٹیاں، تو اس

کے لیے یہ بیس فی صد تو اتنے تھے کہ وہ سال بھر اس سے کام چلا لیں۔ انھوں نے خود دیکھا تھا کہ قصائی، جانور کاٹنے کے اچھے خاصے پیسے لیتے ہیں۔

جب ماموں نے خیر دین قصائی کو اپنے وائی فائی سسٹم سے بھی گاہکوں کی بکنگ کرنے کا آئیڈیا دیا تو وہ بے حد خوش ہو گیا۔ اس نے کہا کہ اگر ان کے بھیجے ہوئے پیغامات کے ذریعے بکنگ ہوئی تو فی بکنگ وہ ان کو سو روپے الگ سے دے گا۔ اب ماموں کو ایک شغل ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے مختلف نمبروں پر لوگوں کو جانوروں کی گھر آ کر صاف ستھری قربانی سستے داموں فوری کرنے کے ایس ایم ایس پیغامات شروع کر دیے۔ بعض کو فری کالوں کے ذریعے بھی مطلع کیا۔ ان کی یہ رابطہ مہم بے حد کامیاب رہی۔ ان کے پاس آرڈر تو بہت آئے لیکن اپنے علاقے کے چار ہی افراد ان تک پہنچ سکے کیوں کہ موبائل نمبر سے شہر کا پتا تو چلتا نہیں ہے؟ دُور دراز کے بہت سے لوگوں نے ان سے رابطے کیے مگر ان کے پاس کوئی ایسی گاڑی نہ تھی کہ وہ اس میں جا کر دُور شہروں میں قربانی کر سکیں۔

''آ گئے منے!'' ماموں اپنی مہم سے تھک تھکا کر پہنچے تو ابن پودینہ نے کھانستے ہوئے ان سے سوال کیا۔

''جی بابا! میں آ گیا۔'' اس نے نہایت انکساری سے کہا۔

''بیٹا! دو دن سے کوئی اچھی چیز کھانے کو نہیں ملی۔ بہت بھوک لگی ہے۔'' انھوں نے اداسی سے کہا۔

''یہ لو۔'' یہ کہہ کر ماموں نے ایک شاپر ان کے آگے رکھ دیا۔ خوشبو کی لپیٹ نے ابن پودینہ کو اچانک سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ''یہ تو..... یہ تو..... نہاری کی سی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔''

''یہ نہاری ہی ہے بابا جان!''

''تم نے یہ خرچا کیسے کر لیا میرے بچے.......'' ابن پودینہ کی طرف سے حیران کن انداز میں سوال کیا گیا۔ وہ جانتے تھے کہ کمانے کی طرف ان کے بیٹے کا کوئی دھیان نہیں ہے۔ لوگ آج کل اسے بھی ادھار دینے سے کترانے لگے ہیں۔

''اس عید پر میں نے کام کا ارادہ کر لیا ہے، اللہ خیر کرے گا۔'' انھوں نے ابن پودینہ کی بات کا جواب دیا۔ پھر خیر دین سے ہونے والی ڈیل کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح چار گاہکوں کی بکنگ پر انھیں قصائی نے 4 سو روپے ایڈوانس دیے ہیں تو اس نے سو روپے خرچ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

''تمھارا بہت بہت شکریہ!'' ابن پودینہ نے انتہائی لجاجت کے ساتھ کہا۔ اس کے بعد ماموں وائی فائی نے فوری پیالہ لے کر اس میں سالن نکالا اور پلیٹ میں تندوری روٹیاں ڈال دیں۔ ابن پودینہ کی رال ٹپک گئی۔ جب ماموں نے نہاری پر لیموں نچوڑا تو ان کی رال باچھوں تک آنے میں دیر نہیں لگی۔ انھوں نے فوری روٹی اٹھائی اور اس کے ساتھ انصاف کرنا شروع کر دیا۔

''بیٹا! تم تو جانتے ہی ہو کہ میرے جوڑوں میں خاصا درد رہنے لگا ہے۔''

''جی جی!''

''ڈاکٹر نے کہا ہوا ہے کہ اگر میں نلی پائے کھاؤں تو میرے جوڑوں کا درد ٹھیک ہو سکتا ہے۔'' وہ اس کے باقی تین سو روپوں کو بھی ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔

''فکر مت کرو بابا! پائے بھی کھلا دوں گا اور عید کے بعد تو آپ کو گوشت ہی گوشت کھلاؤں گا...'' اس نے خوشی سے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ کھانے کی اچھی اچھی باتوں نے ابن پودینہ کو خوابوں کی دُنیا میں پہنچا دیا۔ وہ اپنے آپ کو سیخ کباب، بریانی اور قورما کھاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ یہ خواب دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھ لگ گئی۔ ماموں نے بچا ہوا سالن صاف کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

☆......☆......☆

''ہیلو! بھائی میں چمن خان بول رہا ہوں۔''

ماموں اپنے موبائل پر وائی فائی کے سگنل سمیٹنے کی کوشش کر رہے تھے کہ انھیں ایک کال موصول ہوئی۔

''کہاں سے بول رہے ہو بھائی!''

''اپنے منہ سے بول رہا ہوں۔ آپ ماموں وائی فائی ہو ناں۔''

''ہاں ہاں! مگر آپ کہاں سے بات کر رہے ہو؟'' وہ رعونت سے بولے۔

''اپنے گھر سے بول رہا ہوں ماموں!'' دوسری جانب سے

بڑی شوخی کے ساتھ کہا گیا۔

''گھر سے تو بات کر رہے ہو مگر کس جگہ سے!'' وہ جھلا کر بولے۔

''میں موبائل سے بات کر رہا ہوں۔ آپ وائی فائی ہی ہو ناں!''

ان کے یہ جملے سن کر وہ چڑ کر رہ گئے۔

''سنو سائیں!'' وہ بولے۔ ''سنا ہے آپ اس بار بکرے کاٹو گے۔'' وہ مسکرا کر بول رہا تھا۔

''ہاں ہاں! آپ اوجڑی اٹھانے والے ہو کیا سائیں!'' ماموں کی رگ ظرافت پھڑکی۔

''ارے نہیں ماموں! میں دراصل آپ کو ایک آرڈر دلانا چاہ رہا ہوں، کیا کمیشن چل رہا ہے آج کل؟''

''تو آپ کمیشن ایجنٹ ہو۔ چلو! آپ کو سو روپے دیں گے۔''

''یار یہ تو بہت کم ہیں، اگر آپ تین سو دیں تو بکنگ کرا دوں، کرموشیدا ڈھائی سو روپے آفر کر چکا ہے۔'' ماموں نے کچھ حیل و حجت کے بعد دو سو روپے میں چمن خان کا آرڈر پکڑ لیا۔ اسی طرح ان کو مزید پانچ سات آرڈر مل گئے۔ خیر دین کو جب علم ہوا تو وہ ماموں وائی فائی کی خدمات سے بے حد خوش ہوا۔

بہرحال! عید کا دن بھی آ گیا۔ دیگر افراد کی طرح ماموں اور خیر دین نے بھی نماز عید ادا کی۔ اس کے بعد وہ دونوں سب سے مہنگے بک کیے گئے بکرے کو کاٹنے کے لیے پہنچ گئے۔ بکرا بڑا طاقت ور تھا لیکن وہ بھی ماموں کے حلیے اور لانبے قد کو دیکھ کر سہم گیا۔ جب خیر دین نے آپریشن کے آلات نکال لیے تو ماموں نے بکرے کو پانی اور چارہ کھلانے کے بعد گرانے میں دیر نہیں لگائی۔ خیر دین تو رسی سے اسے باندھنا چاہ رہا تھا لیکن ماموں نے اسے ایسا دبوچا کہ وہ چیں بھی نہ کر سکا۔ پہلی قربانی آسانی سے نمٹی تو قصائی کو اپنے نئے شاگرد کی کارکردگی پر بہت خوشی ہوئی۔

اسی طرح وہ قربانیاں کرتے چلے گئے۔ گائے کی قربانی میں تھوڑی بہت پریشانی ہوئی لیکن ایک کے بعد دوسری کے لیے ماموں نے اس میں بھی مہارت دکھائی۔ دو دن میں انھوں نے تیس جانور کاٹے۔ ماموں کو ہزاروں روپوں کے ساتھ ساتھ گوشت بھی وافر مقدار میں ملا۔ ابن پودینہ اپنے جوڑوں کا درد بھول کر گوشت بھوننے اور پھر دونوں مل کر اسے کھانے میں مصروف ہو گئے۔

عید کے تیسرے روز خیر دین نے ایک اونٹ کی قربانی دس ہزار روپے میں بک کر لی تھی۔ یہ اندر کی بات تھی کہ خیر دین کے اساتذہ نے تو اونٹ کاٹا تھا۔ اس نے خود نہیں کاٹا تھا لیکن ماموں کی حوصلہ افزائی سے وہ ہمت پکڑ چکا تھا۔ جب وہ لوگ اونٹ کاٹنے پہنچے تو ان کے ہاتھ پاؤں اس لیے پھول گئے کہ اس کی قربانی دیکھنے کے لیے سیکڑوں لوگ محلے مین جمع تھے۔ پھر وہ اونٹ اتنا لمبا تڑنگا اور طاقت ور دکھائی دیا کہ ان کی سوچ کی راہیں ایک دم بکھر گئیں۔ وہ ماموں ہی کیا جو کسی مشکل سے ڈر جائیں۔ انھوں نے اپنے لانبے قد کا فائدہ اٹھایا اور اونٹ کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے۔ اونٹ پر کچھ تو اثر ہوا لیکن وہ اپنے قد کے برابر کا آدمی دیکھ کر پہلے کچھ گھگھیایا، اس کے بعد ماموں کی گنجی کھوپڑی دیکھ کر کچھ مشتعل ہوا۔ اس نے اپنے منہ سے عجیب سی آواز نکالی جسے سن کر ماموں بھی کچھ پرے ہٹ گئے۔ اب اونٹ کی آنکھیں شعلہ بار تھیں اور اس کے منہ سے جگالی کی جھاگ بھی تیزی سے باہر آ رہی تھی۔

تمام افراد کی نظریں ان کی جانب تھیں۔ اب اس معاملے میں دیر ان کے لیے پریشانی کا باعث ہو سکتی تھی اس لیے خیر دین نے رسی نکال کر ماموں کی طرف بڑھائی۔ ماموں نے پھندا بنا کر اونٹ کی اگلی ٹانگوں میں لپیٹنا چاہا تو اس نے احتجاجاً اپنی ٹانگ پیچھے کر لی، ماموں آگے بڑھے تو اسے ان کی یہ حرکت پسند نہ آئی اور اس نے زور سے لات ان کے جڑ دی۔ ماموں دور جا گرے۔

خیر دین نے یہ دیکھا تو اس کی گردن کی رسی کھینچ کر دباؤ دیا کہ اسے قربان کر کے سرخ رو ہوا جائے۔ یہ اونٹ تھا کوئی بکرا تو نہ تھا کہ آسانی سے قابو آ جاتا۔

خیر دین کے ایک اور شاگرد نے تلوار نما چھری نکال کر استاد کی طرف بڑھائی اور خود اونٹ کو سنبھالنے لگا۔ ماموں بھی سنبھل کر اونٹ کو نیچا دکھانے اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ خیر دین نے تلوار سے اس کی گردن پر وار کرنا چاہا لیکن اونٹ اس حملے سے باخبر تھا۔ اس نے اچھل کر اس وار کو خالی کر دیا اور رسی بھی چھڑا لی۔

عوام اس دل چسپ مظاہرے کو دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔

لوگوں نے تالیاں بجا کر ماموں کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی جسے اونٹ نے اپنی سبکی محسوس کی اور اس نے بدلہ چکانے کی ٹھان لی۔ وہ ایک دم اچھلا اور اس نے پوری طاقت سے اپنی رسیاں چھڑالیں اور سامنے کی طرف جست لگائی۔ بچے بوڑھے جو اس قربانی کو دیکھنے کے لیے آنکھیں گاڑے کھڑے تھے، اونٹ کی اس عجیب وغریب حرکت سے ڈر کر ایک طرف ہوئے لیکن وہ بھاگ کر ان ہی لوگوں کو گراتا ہوا مجمع سے باہر نکلا۔

لوگ ایک دوسرے پر گرتے ہوئے اِدھر اُدھر ہوئے۔ اونٹ کے مالک کو فکر ہوئی تو وہ اپنے اونٹ کو پکڑنے کے لیے دوڑا۔ اس کی دیکھا دیکھی قصائی گروپ بھی اونٹ کے پیچھے ہوا۔ مجمع بھلا کیسے پیچھے رہتا۔ وہ سب بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ اونٹ اتنے بڑے مجمع کو اپنے پیچھے دیکھ کر بپھر چکا تھا اور تیزی سے دائیں بائیں ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ماموں اس اونٹ کو پکڑنے کے لیے سب سے آگے تھے۔ ان کے قدم تیزی سے اونٹ کی جانب بڑھ رہے تھے۔

جب اونٹ کو خطرہ اپنی طرف بڑھتا نظر آیا تو اس نے سڑک سے نچلی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ ماموں وائی فائی اچک کر کچے میں اتر گئے۔ ابھی وہ اس تک پہنچا ہی چاہتے تھے کہ غڑاپ سے ایک دھماکا ہوا اور اونٹ سامنے کی طرف ایک گندے نالے میں جا گرا۔

''یہ تم نے کیا کیا نالائق!'' اونٹ کا مالک ماموں تک پہنچ چکا تھا، وہ غصے سے آنکھیں نکالتا ہوا بولا۔

''مم.....میں .....نے؟!'' ماموں نے چونک کر پہلے مالک کی طرف اور پھر نالے میں گرے اونٹ کی طرف دیکھا جو باہر نکلنے کے لیے اپنے پیر اِدھر اُدھر مار رہا تھا۔ وہ تو نیک نیتی سے اونٹ کو قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اگر میرے اونٹ کو کوئی نقصان پہنچا تو ڈھائی لاکھ کی رقم تم لوگوں سے نکلواؤں گا۔'' خیر دین بھی قریب پہنچ چکا تھا اور اونٹ کا مالک لال آنکھیں گھماتا ہوا ان سے کہہ رہا تھا۔

ماموں حیرانی و پریشانی سے کبھی اپنی ٹنڈ پر ہاتھ پھیر رہے تھے تو کبھی اونٹ کو دیکھ رہے تھے، کبھی وہ مالک کی غصیلی نظروں کو جانچ رہے تھے اور کبھی خیر دین کی نگاہوں کو دیکھ رہے تھے جو تین دن تک اس پر پیار نچھاور کر رہی تھیں لیکن اب وہ شعلے برسا رہی تھیں۔

ماموں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سب کے سب اونٹ کے گرنے کا ذمہ دار ان ہی کو گردان رہے ہوں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ تین دنوں کی محنت کے بعد جو سات ہزار سات سو روپے انھوں نے کمائے ہیں، کہیں وہ ہرجانے کے طور پر تو نہیں چلے جائیں گے اور ہوا بھی یہی کہ کرین کے ذریعے اونٹ نکلوانے پر جو بیس ہزار روپے خرچ ہوئے، وہ خیر دین اور اس کی ٹیم نے ہی ادا کیے۔

ماموں وائی فائی سوچ رہے تھے کہ کھایا پیا کچھ نہیں اور گلاس توڑا تو مال بھی چلا گیا۔

## کھوج لگایئے میں حصہ لینے والوں کے نام

محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ محمد حنظلہ، سنجوال کینٹ۔ عدنان ملک، نوشہرہ۔ رمشاء عمران، پشاور۔ رمنا سعید، گوجرانوالہ۔ عبدالجبار، لاہور۔ مناہل افضل، لاہور۔ ولید اشرف، گوجرہ۔ مریم جاوید، لاہور۔ عروج ندیم، مردان۔ مناہل نسیم، اسلام آباد۔ محمد فرحان، واہ کینٹ۔ سارا رضوان، لاہور۔ حامد علی، جوہر آباد۔ سدرہ ستار، صوابی۔ محمد عثمان، سمرالہ۔ نصر علی قاسم، لاہور۔ محمد ہاشم اسلم، گوجرانوالہ۔ مناہل شاہد، راول پنڈی۔ کومل صادق چوہدری، گوجرانوالہ۔ حذیفہ بشیر، راہوالی۔ محمد عامر ریحان، ڈی آئی خان۔ سلمان طاہر، راہوالی۔ ابوعبیدہ الجراح، لاہور۔ عائشہ ثناء، راہوالی۔ راحیہ ثاقب محمود، پنڈ دادنخان۔ محمد افضل انصاری، لاہور۔ ماہ رخ آمنہ، چیچہ وطنی۔ محمد احمد ریاض، اوکاڑہ۔ مریم صدیقہ، گوجرانوالہ۔ عائشہ خالد، ملتان۔ زین خان، سرگودھا۔ محمد حبیب الرحمٰن، جہلم۔ محمد یحییٰ خالد، ملتان۔ حمزہ فیصل، گوجرانوالہ۔ احمد عبداللہ، میانوالی۔ کامران ہمایوں، لاہور۔ حنفیہ نوید، اوکاڑہ۔ وانیا سہیل، اٹک۔ محمد ابوہریرہ، علی پور چٹھہ۔ محمد انیق اسد، اسلام آباد۔ فصیحہ آفرین، کراچی۔ عروج طارق، سیال کوٹ۔ محمد حذیفہ انوار، جھنگ۔ محمد عمیس، کلورکوٹ۔ ناعمہ تحریم، کراچی۔ محمد ابرار اشرف، سدوال کلاں۔ شاہ زیب علی، بھلوال۔ ثوبیہ انجم، میر پور آزاد کشمیر۔ عثمان علی، جھنگ۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ مریم یوسف، لاہور۔ رحیقہ شہزاد، گجرات۔ محمد صادق علی، کوٹری۔ عبداللہ انصاری، حیدر آباد۔ ابوذر وسیم، بنوں۔ وجیہہ الدین، کوہاٹ۔ محمد عبداللہ انصاری، بھکر۔ محمد نعمان، ساہیوال۔ محمد ہادی عارف، لاہور۔

# نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی

خالہ نوراں محلے بھر کی خالہ تھی۔ چھوٹے بڑے سب ہی اسے خالہ نوراں کہتے تھے۔ بعض عورتوں نے اس کے اور نام بھی رکھے ہوئے تھے۔ پیٹھ پیچھے کوئی اسے مسکین بلی کہتی، کوئی بھیگی بلی کا خطاب دیتی اور یہ نام خالہ نوراں پر سجتے بھی خوب تھے کیوں کہ اس کی صورت دیکھ کر واقعی کوئی بلی یاد آتی تھی۔ پتلا دبلا جسم، چھوٹا سا چہرہ جیسے گول سی ڈبیا پر سارے نقش بنے ہوں، بلی جیسا تکون ماتھا، گھنی بھنوؤں کے نیچے زرد آنکھیں، چھوٹی سی ناک اور گول سی ٹھوڑی۔

خالہ نوراں کا محلے کے ہر گھر میں آنا جانا تھا۔ ویسے تو سب سلام دُعا کرتے، چائے پانی بھی پوچھتے مگر دل ہی دل میں سب ہی اس سے گریز کرتے کیوں کہ خالہ نوراں میں ایک بہت بُری عادت تھی کہ وہ لگائی بجھائی کرتی رہتی تھی۔ اس کی وجہ سے محلے میں بڑی لڑائیاں ہو چکی تھیں۔ عورتوں کی لڑائی میں مرد بھی لپیٹ میں آجاتے اور سر پھٹول تک نوبت پہنچ جاتی۔ لڑائی کرا کے خالہ نوراں خود معصوم صورت بنا کر صاف مکر جاتی کہ اس نے تو کچھ کہا ہی نہیں۔ پھر ایسا ہوا کہ بڑھاپے میں پہنچتے تک اسے شاید کچھ عقل آگئی اور اس نے لوگوں کے معاملوں میں دخل دینا چھوڑ دیا مگر پھر بھی کسی کا اس پر اعتماد بحال نہ ہو سکا۔

ایک سال خبر پھیلی کہ خالہ نوراں حج کو جا رہی ہے۔ یہ سنتے ہی عورتوں نے فقرے بازی شروع کی۔

"لو خالہ! تمہیں معلوم ہے کہ میری بلی بھی حج کو جا رہی ہے اور وظیفے میں پڑھتی ہے، بے شک رزق آسمان سے آتا ہے۔" اس پر دوسری عورت ہنس کر بولی: "اور آسمان سے رزق یوں آتا ہے کہ مسجد میں بیٹھی دو چار چوہے اور کھا لیتی ہے۔" تیسری نے فقرہ کسا: "اب تک نو سو چوہے کھا چکی ہے اور اب حج کو چلی ہے!" اس پر سب نے قہقہہ لگایا۔ خالہ نوراں ٹکر ٹکر سب کا منہ تک رہی تھی اور وہ ہنستے ہنستے ایک دوسری کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر داد دیتے ہوئے بولیں: "ارے ہاں یہ ٹھیک ہے...... نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔"

خالہ نوراں ان کی فقرے بازی کو سمجھ گئی اور چپکے سے اٹھ کر چلی گئی۔ عورتوں کے کہے ہوئے اس فقرے کا مطلب ہے جب کوئی شخص بہت سی برائیاں کرنے کے بعد نیک بننے کی کوشش کرے تو لوگ اس کی توبہ پر یقین نہ کرتے ہوئے اس کی ماضی کی برائیوں کا حوالہ دے کر کہتے ہیں: نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی۔

# مختصر مختصر

## نعت

زندگی مل گئی مدینے میں
ہر خوشی مل گئی مدینے میں

مجھ گناہ گار کو عطا کر دی
چاکری مل گئی مدینے میں

دل کے اندر بہت اداسی تھی
خوشی مل گئی مدینے میں

نور سے بھر گیا مرا دامن
روشنی مل گئی مدینے میں

بے مزا زندگی گزاری تھی
چاشنی مل گئی مدینے میں

(ریحان آفاق)

## زیورِ علم

دادی نانی کا کہنا ہے
علم تو اپنا گہنا ہے
خوب پڑھو اور خوب پڑھاؤ
ہر گھر میں اسکول بناؤ
ساری دُنیا میں اسکول بناؤ
ساری دُنیا پر چھا جاؤ
عزت سے گر رہنا ہے
علم تو اپنا گہنا ہے

(سرشار صدیقی)

## ہیرے جواہرات

☆ بندہ اپنے پروردگار سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔

☆ وقفے سے ملا کرو، اس سے محبت بڑھتی ہے۔

☆ قول حضرت عمر فاروقؓ: اپنے معاملات میں ان لوگوں سے مشورہ لو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔

☆ قول حضرت علیؓ: غور سے سنو! جو حق سے نفع نہیں اٹھاتا اسے باطل ضرور نقصان پہنچاتا ہے۔ (محمد طیب طوفانی، سرائے نورنگ)

## آج کا کام

آج کا کام کل پر چھوڑنے والے شخص کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی شخص اگر کسی مضبوط درخت کو نہ اکھاڑ سکے تو اسے اگلے دن اکھاڑنے کا ارادہ کرے، حالاں کہ درخت روز بروز مضبوط ہوگا اور آدمی کمزور ہوتا جائے گا، اس لیے آج کا کام کل پر چھوڑنے کی بجائے آج، بلکہ ابھی کام ختم کرنے کا عزم کرلیں۔ (انصر علی، دہاڑی)

## فیصلہ

خلیفہ ہارون الرشید کا دور تھا۔ ایک شخص نے کسی کے ہاتھ کنواں فروخت کیا۔ خریدنے والا شخص کنویں سے پانی بھرنے لگا۔ بیچنے والے نے اعتراض کیا: ”میں نے صرف کنواں بیچا ہے، پانی نہیں، پانی میرا ہے۔“

معاملہ ہارون کے دربار میں پہنچا۔ دونوں باتیں غور سے سنی گئیں۔ پھر خلیفہ نے بیچنے والے سے کہا: ”بے شک تم نے پانی نہیں بیچا لیکن تم نے بیچتے وقت پانی کیوں نہیں نکالا۔ اگر تم نے کل تک سارا پانی نہ نکالا تو جرمانہ ہوگا۔“

کنویں کا سابقہ مالک کھسیا گیا۔ مجبوراً اسے راضی نامہ داخل کرنا پڑا۔ (عجوئی ارسلان، راول پنڈی)

## کتاب

☆ جو شخص کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں رکھتا، وہ معراجِ انسانی سے گرا ہوتا ہے۔

☆ ہم دولت سے کتاب تو خرید سکتے ہیں مگر علم نہیں۔

☆ جس آدمی کے پاس کتاب ہے وہ تنہا نہیں۔

☆ خیالات کی جنگ میں کتاب ہتھیار کا کام کرتی ہے۔

(آفتاب عدیل، لاہور)

تھے۔ شیر بیٹی بھی ان میں موجود تھی۔ مریم شو کے دوران بے حد سنجیدہ رہتی تھی۔ وہ کسی شیر کو اپنی مرضی سے کوئی حرکت نہیں کرنے دیتی تھی، خواہ وہ شیر بیٹی ہی کیوں نہ ہو۔ اچانک شیر بیٹی کو شرارت سوجھی اور اس نے خلاف معمول ایک عجیب سی حرکت کی۔ مریم نے اپنا چابک لہرا دیا۔ چابک شیر بیٹی کی کمر پر پڑا۔ شیر بیٹی نے اچک کر اپنے آپ کو بچانا چاہا۔ یہ بھی سرکس کے اصول کے خلاف تھا، لیکن لوگ اس بات کو بھی سرکس کے شو کا حصہ سمجھ کر بے تحاشا تالیاں بجا رہے تھے اور زور شور سے داد دے رہے تھے۔ لیکن مریم جانتی تھی کہ شیر بیٹی کو قابو کرنا بہت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو وہ بے قابو ہو کر تماشائیوں پر چھلانگ لگا دے۔ اس نے پوری طاقت سے دو تین چابک شیر بیٹی کو رسید کر دیے۔ مریم کا خیال تھا کہ وہ یہ زور دار چابک کھا کر سیدھی ہو جائے گی اور شو دوبارہ شروع ہو جائے گا لیکن عین اس وقت شیر بیٹی نے مریم پر چھلانگ لگا دی۔ مریم اس بات کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ فرش پر گر پڑی۔ قریب تھا کہ شیر بیٹی اسے اپنے پنجوں میں دبوچ لے، اسی وقت ایک گولی آئی اور شیر بیٹی کے ماتھے میں پیوست ہو گئی۔ وہ اسی وقت زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کے ماتھے سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ لوگ جو زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے اور اسے شو کا حصہ سمجھ کر دل کھول کر داد دے رہے تھے، اچانک انہیں جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے عجیب منظر تھا۔ مریم ایک طرف ساکت کھڑی تھی (دوسرے شیر پہلے ہی لے جائے جا چکے تھے چوں کہ شو کے آخری حصے میں مریم اور شیر بیٹی رنگ کے اندر ہوتی تھیں) شیر بیٹی بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کے چاروں طرف خون ہی خون تھا۔ میجر ڈارسی بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے بندوق پھینک دی اور پستول نکال کر اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔ اس کے کھڑے ملازم نے برق رفتاری سے پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ ملازم کی بروقت مداخلت سے میجر کی جان تو بچ گئی مگر وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہا تھا۔ اب وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ مریم اپنی ہر کوشش کر کے ہار گئی تھی۔ ڈاکٹر بھی مایوس ہو گئے تھے۔ وہ سارا دن بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ اگر کبھی بولتا تو بس ایک جملہ اس کی زبان سے ادا ہوتا تھا۔

”شیر بیٹی مجھے معاف کر دینا۔“

مریم نے سرکس اونے پونے داموں میں فروخت کر دیا تھا اور دن رات شوہر کی خدمت میں مصروف رہتی تھی لیکن میجر ڈارسی کو تو اپنی بیوی بھی یاد نہیں تھی جس کے لیے اس نے شیر بیٹی کو ہلاک کر دیا تھا اور پھر اس کے لیے اپنی جان لینے کی بھی کوشش کی تھی۔

# قائدِ ملت لیاقت علی خان

لیاقت علی خان پاکستان کے سیاست دان اور ملک کے پہلے وزیر اعظم تھے۔ آپ 1895ء میں کرنال کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباء و اجداد پانچ سو برس پہلے ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ آپ نے 1918ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور 1919ء میں انگلستان گئے جہاں 1922ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ قیام انگلستان کے دوران سیاست میں سرگرمی عمل کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا اور 1933ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ انگلستان سے واپسی پر یو۔ پی میں رہائش اختیار کی اور 1926ء میں یو۔ پی کے رکن منتخب ہوئے۔ آپ چودہ سال اسمبلی کے رکن رہے اور چھ سال نائب صدر۔ ان دنوں آپ یو۔ پی میں ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنما تھے اور مرکزی اسمبلی میں قائداعظم اسی پارٹی کے لیڈر تھے۔ 1937ء میں کل ہند مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ 1940ء میں مرکزی اسمبلی پارٹی کے لیڈر چنے گئے۔ قیام پاکستان تک اسمبلی کے ممبر رہے۔ لارڈ ویول کے عہد میں آپ عبوری حکومت میں وزیر خزانہ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور پہلے ہندوستانی وزیر کا بنایا ہوا بجٹ پیش کیا جسے غریب کا بجٹ کہا گیا۔

16 اکتوبر 1951ء کو آپ راول پنڈی میں ایک جلسے سے خطاب کر رہے تھے۔ ابھی ان کی زبان سے صرف ”برادرانِ اسلام“ کے الفاظ نکلے ہی تھے کہ یکے بعد دیگرے دو گولیاں آئیں اور لیاقت علی خان کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔ لیاقت علی خان کی زبان سے دو مرتبہ کلمہ طیبہ نکلا اور تیسرا اور آخری کلمہ جو نکلا وہ یہ تھا: ”پاکستان کا خدا حافظ ہے۔“

کعبہ...... اللہ تعالیٰ کا عظیم گھر ہے۔ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر اپنے دستِ مبارک سے سرزمینِ مکہ میں تعمیر کیا۔ ذوالحجہ کی ۱۰ تاریخ کو لاکھوں حجاج اللہ تعالیٰ کے اس مبارک گھر کا طواف کرتے ہیں اور غلافِ کعبہ کو پکڑ کر اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی غلافِ کعبہ سے محبت و عقیدت بہت زیادہ ہے۔

غلافِ کعبہ کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی، اس حوالے سے تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ کے گھر کو پہلی دفعہ جس ہستی نے ڈھانپا، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔

کعبۃ اللہ پر غلاف چڑھانے کی رسم بہت قدیم ہے۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روایت کو زندہ کیا اور غلاف چڑھایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدینؓ نے اس سنت کی پیروی کی۔ غلاف چڑھانے کے حوالے سے مختلف تواریخ مختلف حوالوں سے ملتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں دس محرم کو نیا غلاف چڑھایا جاتا تھا، جب کہ بعد میں سال میں دو غلاف مختلف تواریخ کو چڑھائے جانے لگے۔ ایک عیدالفطر کے روز اور دوسرا دس محرم کو۔ بعد میں حج کے موقع پر بھی غلاف چڑھایا جانے لگا۔ ایک لمبے عرصے تک سیاہ رنگ کا غلاف تیار کیا جاتا رہا، لیکن رنگوں کے حوالے سے کوئی قید نہیں ہے۔ ساتویں صدی تک مختلف رنگوں کے غلاف تیار ہوتے رہے۔ ساتویں صدی میں ایک عباسی خلیفہ نے سیاہ رنگ کا غلاف بنوایا۔ بعد ازاں اس کا ''تتبع'' کیا گیا۔ مختلف زبانوں میں مختلف ملکوں اور بادشاہوں کی طرف سے غلاف، خانہ کعبہ کے لیے بھجوائے جاتے رہے۔ تقریباً ایک ہزار برس تک یہ غلاف مصر میں تیار ہوتا رہا۔ اہلِ مصر اسے بڑی محبت و عقیدت سے تیار کرتے تھے اور مصر سے غلاف روانہ کرتے وقت بڑے اہتمام کا مظاہرہ کیا جاتا رہا۔ غلاف کو محل میں رکھ کر اس کی نمائش کی جاتی اور پھر جلوس نکالا جاتا تھا۔ جب غلاف مکہ پہنچ جاتا تو اس کی پیشوائی کی جاتی۔

ظہورِ اسلام سے قبل بھی کعبہ پر غلاف چڑھانے کی رسم موجود تھی۔ فتح مکہ کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں

تشریف لے گئے تو کعبہ پر غلاف موجود تھا۔ اس وقت اللہ کے گھر کی حفاظت قریش کیا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ پر یمنی چادروں کا نیا غلاف چڑھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ ہر سال غلاف چڑھاتے رہے۔ اس وقت پرانے غلاف کے ٹکڑے غرباء میں تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کچھ عرصہ تک غلاف کو دفن کرنا شروع کیا لیکن بعد ازاں اس کے ٹکڑے تقسیم ہونے لگے۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں بھی ہر سال نیا غلاف چڑھایا جاتا رہا۔ امیر معاویہؓ کے عہد میں بھی کعبہ پر ریشمی غلاف چڑھایا جاتا رہا اور پھر دو یا تین ماہ بعد یہ غلاف بدل دیا جاتا۔ تمام اموی خلفاء نے اس دستور کو قائم رکھا۔ عباسیوں کے عہد میں بھی ریشمی غلاف بنوائے جاتے اور کعبہ کی زینت بنتے۔ اکثر اوقات یوں ہوتا کہ پرانے غلاف نہ اتارے جاتے۔ ۱۴۰ ہجری میں غلاف پر لکھائی ہونے لگی جو اب تک جاری ہے۔

اس صدی کی چھٹی دہائی میں جب مصر میں صدر جمال عبدالناصر برسر اقتدار آئے تو سعودی عرب اور مصر میں اختلافات کی خلیج حائل ہوگئی۔ یہ اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ سعودی عرب نے مصر سے غلافِ کعبہ لینے سے انکار کر دیا۔

۱۳۴۲ ہجری میں پہلی دفعہ نائیلون سے بنا غلاف، کعبہ کی زینت بنایا گیا۔ ۱۳۴۵ ہجری میں ایک بار پھر سعودی عرب اور مصر میں اختلافات سر اٹھانے لگے۔ چنانچہ سعودی حکومت نے اپنے طور پر غلاف تیار کرنا شروع کر دیا۔ ۱۳۵۶ ہجری میں جب اختلافات ختم ہو گئے تو ایک بار پھر مصر نے سعودی عرب غلاف بھیجنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ تک بھارت نے بھی سعودی عرب غلاف بھجوائے۔

۱۹۶۳ء میں غلافِ کعبہ کی تیاری کرنے کی سعادت پاکستان کے حصے میں آئی اور پاکستانی کاریگروں نے بڑی محنت، عقیدت اور محبت سے غلاف تیار کیا۔ جب غلاف تیار ہو گیا تو سب سے پہلے اس کی زیارت کا اہتمام کراچی میں کیا گیا۔ پھر ۹ مارچ ۱۹۶۳ء کو ایک نجی ادارے کے زیر اہتمام یہ غلاف بذریعہ ٹرین مغربی پاکستان کے سفر پر روانہ ہوا تا کہ دوسرے شہروں کے لوگ بھی اس کی زیارت کر سکیں۔ جب اس کی زیارت کا عمل مکمل ہو گیا تو اسے واپس کراچی لایا گیا، جہاں سے اسے سعودی عرب روانہ کر دیا گیا۔

پھر سعودی عرب نے بھی غلاف تیار کرنے کے بہت سے کارخانے لگائے جہاں سینکڑوں مسلمان کام کر رہے ہیں، جن میں بہت سے پاکستانی بھی ہیں۔

غلافِ کعبہ کے حوالے سے اہم معلومات درج ذیل ہیں۔

۱۔ غلافِ کعبہ کو عربی میں ''کسوا'' کہا جاتا ہے جس کا مطلب سیاہ رنگ کا کپڑا ہے۔
۲۔ ہر سال ۹ ذوالحجہ کو غلافِ کعبہ تبدیل کیا جاتا ہے۔
۳۔ غلافِ کعبہ سیاہ رنگ کی ریشم سے بنا ہوتا ہے اور اس پر سنہری ریشم سے قرآنی آیات لکھی جاتی ہیں۔
۴۔ غلافِ کعبہ کی تیاری پر جو اخراجات آتے ہیں، وہ تقریباً ایک کروڑ ۷۰ لاکھ سعودی ریال ہیں۔
۵۔ غلافِ کعبہ تقریباً ۶۵۸ مربع میٹر طویل ہوتا ہے۔
۶۔ غلافِ کعبہ کا وزن ۶۷۰ کلوگرام ہوتا ہے۔
۷۔ غلافِ کعبہ کو ریشم کے کپڑے کے ۴۷ ٹکڑوں سے جوڑ کر مکمل کیا جاتا ہے۔ ہر ٹکڑا تقریباً ۱۴ میٹر لمبا اور ۱۰۱ سینٹی میٹر چوڑا ہوتا ہے۔
۸۔ غلافِ کعبہ کو تبدیل کرنے میں کم و بیش ۴ گھنٹے لگتے ہیں۔
۹۔ غلافِ کعبہ پر ۱۲۰ کلو خالص سونے کی تار اور ۵۰ کلو خالص چاندی کی تار سے قرآنی آیات لکھی جاتی ہیں۔
۱۰۔ غلافِ کعبہ کے زیریں حصہ میں کاپر (Copper) کے چھلے لگے ہوتے ہیں، جن کے ذریعے غلاف کو مضبوطی سے باندھا جاتا ہے۔

بیت اللہ کو کپڑے سے ڈھانپنا مذہبی فریضہ اور بہت بڑی سعادت ہے۔ یہ سعادت و ذمہ داری سعودی عرب کے مشہور و معروف قبیلے قریش کے حصے میں آئی۔ آج یہ ذمہ داری سعودی فرماں روا خادم حرمین شریفین اپنی سرپرستی میں غلافِ کعبہ تیار کرواتے اور اسے خانہ کعبہ پر چڑھاتے ہیں۔

استاد: بیٹا کاغذ کیوں کھا رہے ہو؟
شاگرد: ڈاکٹر نے مجھے ہلکی غذا کھانے کو کہا ہے۔ (فارعہ فہیم، لاہور)

پہلا پاگل: ٹائم کیا ہوا ہے؟
دوسرا پاگل: ایک بج کے پینتالیس منٹ۔
تیسرا پاگل: لیکن میری گھڑی پر تو دو بجنے میں 15 منٹ باقی ہیں۔
چوتھا پاگل: تم دونوں ہی غلط ہو۔ پونے دو ہوئے ہیں۔
(امان احمد، فیصل آباد)

ایک صاحب نے گھبراہٹ میں ڈاکٹر کو فون کیا:
ڈاکٹر صاحب! میرے بچے کو کرنٹ لگ گیا ہے، میں کیا کروں؟
ڈاکٹر: سب سے پہلے شکرانے کے نفل پڑھیں کہ آپ کے گھر میں بجلی آ رہی ہے۔ (محمد سعید رضا، بورے والا)

استاد (بچوں کو پرچے کے بارے میں بتاتے ہوئے): دیکھو! آپ کا پرچہ کل ہے۔ اس کے بارے میں کوئی سوال ہو تو پوچھیے۔
شاگرد: سر پرچے میں کون سے سوال آئیں گے؟
(عدنان ملک، حمزہ رشکہ)

جج (ملزم سے): تم نے مقتول کو پانی میں زہر کیوں ملا کر دیا۔
ملزم: جناب! اس نے خود یہ کہا تھا کہ ایسا پانی پلاؤ کہ ٹھنڈا ہو جاؤں۔
(زنیرہ شاہ، اٹک)

ماں (بیٹے سے): تم کیوں رو رہے ہو؟
بیٹا: ماسٹر صاحب نے مارا ہے۔
ماں: تم نے ضرور کوئی شرارت کی ہوگی۔
بیٹا: نہیں، امی جان! میں تو بس کلاس میں سو رہا تھا۔
(نازیہ بتول، جھنگ)

کسی گاؤں میں ایک بھیڑیا گھس آیا۔ سارے گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک بہت موٹی عورت اپنے خاوند سے بولی:
آؤ! ہم بھی بھاگ چلیں، کہیں بھیڑیا اٹھا کر نہ لے جائے۔
خاوند بولا: تم کیوں ڈرتی ہو۔ وہ بھیڑیا ہے، کرین تو نہیں ہے۔
(انجم نعیم، کراچی)

ماں اور بچہ بس میں سوار ہوئے۔ ماں نے اپنا ٹکٹ تو لے لیا مگر بچے کا ٹکٹ نہ لیا۔ کنڈیکٹر نے بچے کی طرف غور سے دیکھا اور بولا: محترمہ! بچے کا بھی ٹکٹ لیجیے۔
ماں: مگر اس کی عمر تو تین سال ہے۔
کنڈیکٹر: لیکن مجھے تو یہ پانچ سال کا نظر آ رہا ہے۔
ماں کو بڑا طیش آیا۔ وہ بولی: بچہ میرا ہے، خواہ مخواہ ماں بننے کی کوشش نہ کرو۔ (زینب کریم، ملتان)

موٹا آدمی (تانگے والے سے): میاں بھئی! کیا مجھے اسٹیشن تک لے چلو گے؟
تانگے والا (اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر): جی ہاں! لے چلوں گا، مگر دو پھیرے لگانے پڑیں گے۔ (یعقوب ندیم، لاہور)

اسلم: اکرم اتنا کماتا ہے مگر پھر بھی روتا ہی رہتا ہے۔ ایک بار پہلے بھی ملاقات ہوئی تھی تو کہتا تھا کہ میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ کل ملا تو بھی یہی رونا رو رہا تھا۔ معلوم نہیں اتنے پیسوں کا وہ کیا کرتا ہے؟
اظہر: وہ تم سے ادھار مانگ رہا ہوگا۔
اسلم: نہیں یار، دوبار میں نے ہی اس سے کچھ روپے ادھار مانگے تھے۔ (عطیہ نور، کوئٹہ)

بھکاری (ایک گھر کے سامنے): اللہ کے واسطے ایک روٹی دیجیے، بھوکا ہوں۔
مالک مکان: معاف کر بابا! روٹی نہیں ہے۔
بھکاری: اللہ کی راہ میں کوئی کپڑا ہی دے دیجیے۔
مالک مکان: معاف کرو میاں! کوئی کپڑا نہیں ہے اس وقت۔
بھکاری: اللہ کے نام پر دو آنے ہی دے دو۔
مالک مکان: کیوں تنگ کر رہے ہو؟ بابا! جاؤ ایک بار کہہ دیا معاف کرو۔ کوئی پیسا نہیں ہے۔
فقیر: تو پھر تم اندر بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ اگر گھر میں کچھ نہیں ہے تو آؤ میرے ساتھ، دونوں مانگنے چلیں۔ (طلعت اکرم، سرگودھا)

اُردو کے ایک بہت ہی پیارے ادیب شاعر شان الحق حقی کے بھلکڑ پن کے کئی واقعات مشہور ہیں۔ جب وہ جیکب لائن کراچی میں رہتے تھے تو وہاں دن کے وقت چوریاں بہت ہوتی تھیں۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ دفتر جانے کے لیے گھر سے رخصت ہوتے تو ان کے بعد ان کی بیگم سلمیٰ گھر کو تالا لگا کر روانہ ہوتیں۔ ایک بار سلمیٰ بیگم کو حقی صاحب سے پہلے جانا تھا۔ انہوں نے کھانے کی میز پر تالا رکھ کر شان صاحب سے کہا: ''آج آپ گھر کو تالا لگا کر جایئے گا۔''

سلمیٰ بیگم کے جانے کے بعد شان صاحب کپڑے پہن کر تیار ہوئے اور حسبِ معمول اہلِ خانہ کو، جو اس وقت موجود نہ تھے، خدا حافظ کہا اور چلے گئے۔ دوپہر کو محلے والوں نے گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا دیکھا تو سمجھے کہ چور گھر میں گھس کر صفایا کر گئے ہیں۔ انہوں نے فون کر کے سلمیٰ بیگم کو بلا لیا۔ سلمیٰ بیگم پریشانی میں گھر پہنچیں۔ دیکھا تو ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔ تالا بھی میز پر وہیں موجود تھا جہاں وہ رکھ کر گئی تھیں۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ شان صاحب تالا لگائے بغیر چلے گئے ہیں۔

انہوں نے اپنی اسی عادت سے متاثر ہو کر نظم ''بھائی بھلکڑ'' لکھی جو بے حد مشہور ہوئی اور سندھ ٹیکسٹ بورڈ جام شورو کے اُردو کے نصاب میں بھی شامل رہی۔

دوست ہیں اپنے بھائی بھلکڑ
باتیں اُن کی ساری گڑ بڑ
راہ چلیں تو رستہ بھولیں
بس میں جائیں تو بستہ بھولیں

یہ نظم سب سے پہلے بی بی سی لندن سے بچوں کے پروگرام میں پڑھی گئی اور بعد میں بچوں کے رسالے میں شائع ہونے کے لیے بھیج دی۔ جب وہ نظم شائع ہوئی تو پتا چلا کہ وہ اس میں اپنے کئی اشعار تو لکھنا ہی بھول گئے تھے۔

شان الحق حقی نہ صرف اچھے شاعر اور نثر نگار تھے بلکہ انہوں نے اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے 15 ستمبر 1917ء کو دہلی میں آنکھ کھولی۔ قرآنِ مجید ناظرہ کے ساتھ انگریزی اور عربی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ اسلامیہ ہائی سکول پشاور، سینٹ اسٹیفنز

کالج دہلی اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں جاری رہا۔

کالج سے نکلتے ہی عملی زندگی کا آغاز ایک خبر رساں ایجنسی میں ملازمت سے کیا۔ پھر ایک کمپنی میں کاپی رائٹر ہو گئے۔ رسالہ ''آج کل'' میں بحیثیت نائب مدیر کام کرتے رہے۔ 1945ء میں پہلی کتاب ''انتخاب ظفر'' انجمن ترقی اُردو، دہلی سے شائع ہوئی۔

قیامِ پاکستان کے بعد وہ دہلی سے ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ آغاز برٹش کونسل لائبریری میں بحیثیت لائبریرین سے کیا۔ 1953ء میں ادارۂ مطبوعات و اطلاعات و نشریات میں افسر اشتہارات، اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیتوں سے فرائض انجام دیے۔ پاکستان ٹیلی ویژن میں بھی منیجر اور کنٹرولر سیلز کے طور پر کام کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اشتہاری کمپنی میں ڈائریکٹر رہے۔ اس کے بعد کینیڈا کو اپنا مسکن بنایا۔

اُن کے اہم کاموں میں اُردو زبان کی ترقی کے لیے روز و شب کا حال بھی ان کا معتبر حوالہ ہے۔ ہوا یوں کہ وزارتِ تعلیمات، حکومت پاکستان نے جون 1958ء کو ترقی اُردو بورڈ (جس کا موجودہ نام اُردو ڈکشنری بورڈ ہے) قائم کیا۔ شان الحق حقی اس بورڈ کے رُکن منتخب ہوئے۔ ممتاز حسن صدر اور بیگم شائستہ اکرام اللہ اس کی نائب صدر ہوئیں۔ بورڈ کے دیگر اراکین میں جوش ملیح آبادی، مولوی عبدالحق، عشرت حسین زبیری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پیر حسام الدین راشدی اور عبدالحفیظ کاردار سمیت دیگر ارکان بھی شامل تھے۔

1959ء میں شان الحق حقی اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ انہوں نے مسلسل سترہ سال تک اس ادارے کے لیے اپنی خدمات اعزازی طور پر انجام دیں اور اس دوران انہوں نے اُردو کے لیے ایک جامع اور مستند لغت کے لیے تیرہ لاکھ اسناد کارڈ تیار کروائے جو ایک کیبنٹ میں سلیقے سے رکھے گئے تھے۔ بعد میں یہ تعداد بیس لاکھ تک پہنچی۔ جب لغت کی تدوین کا کام شروع ہوا تو اس مقصد کے لیے کتابیں جمع کرنی شروع کیں۔ انہیں اس مقصد کے لیے حیدر آباد دکن بھی جانا پڑا۔ انہوں نے اسی مقصد کے لیے اچھا خاصا ذخیرہ کتب بڑی محنت اور عرق ریزی سے کیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انہوں نے اس کام کے لیے اتوار کا دن منتخب کیا کہ وہ جہاں ملازمت کرتے تھے وہاں اتوار کو تعطیل تھی، اس لیے وہ اس آرام والے دن اُردو لغت کی تدوین میں صرف کرتے اور سارا دن بورڈ کے دفتر میں ہی کام کر کے گزارتے، اس کے علاوہ کسی اور دن بھی تعطیل ہوتی تو وہ بورڈ کے دفتر میں ہی کام کرتے رہتے اور بسا اوقات رات دیر تک کام کرتے۔ صبح جب عملہ تعطیل گزار کر آتا تو میز پر ان کے لیے کام کا ڈھیر لگا رہتا جو افسر انتظامی متعلقہ لوگوں کے حوالے کرتے۔ انہوں نے اس دوران گیارہ جلدوں کا کام مکمل کر لیا تھا، مگر سازشوں کی بناء پر انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔

شان الحق حقی نے شاعری کے ساتھ افسانے اور ڈرامے بھی لکھے۔ دوسری زبانوں کے ادب کو اُردو میں منتقل کیا۔ ان کا کیا ہوا ترجمہ سلیس اور رواں ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ ہی اصل تحریر ہے۔ انہوں نے انگریزی زبان کے مشہور شاعر ولیم شیکسپئر کے کئی ڈراموں کا منظوم ترجمہ بھی کیا جو ایک مشکل کام تھا۔

وزارت اطلاعات و نشریات میں ان کی زیر نگرانی اُردو ماہنامہ ''ماہ نو'' کے علاوہ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں میں پشتو، سندھی، بلوچی اور پنجابی زبانوں میں بھی رسالے شائع ہوتے تھے۔ 1957ء میں انہوں نے مشہور انگریزی ناول Shone کا ترجمہ کیا۔ 1958ء میں ان کی شاعری کا مجموعہ ''تارِ پیراہن'' کراچی سے شائع ہوا جسے مجلس ترقی اُردو لاہور نے پہلا ادبی انعام دیا۔

انہوں نے آٹھ سال لگاتار محنت کر کے فرہنگ تلفظ بنائی جسے انہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی اور مشفق خواجہ کے اصرار پر انجام دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک بین الاقوامی پبلشرز کے لیے انگریزی اُردو ڈکشنری بھی مرتب کی۔ یہ دونوں اتنے بڑے کام ہیں جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دراصل اداروں کے کرنے کے کام ہوتے ہیں۔ انہوں نے تنہا یہ کام کر کے کام کی عظمت کو ثابت کر دکھایا۔

اُردو کی خدمت کرنے والے اس پیارے انسان کا 11 اکتوبر 2005ء کو کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

# نیلی روشنی کا راز

## خوف ناک رات

آفتاب احمد

جب وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ آصف نے جا کر اپنے مریض کی نبض ٹٹولی۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ ''دیکھو، کوہِ نور سے پھر روشنی نکلنا شروع ہو گئی ہے۔ اب تو ہمیں لیمپ جلانے کی بھی ضرورت نہیں۔'' بلال نے کہا۔ ''وہ کوہِ نور کی چوٹی نظر آ رہی ہے۔''

''یہ روشنی ہے تو بہت خوب صورت مگر بہت خطرناک بھی ہے۔'' ندیم بولا۔ ''اگر ہمارے پاس راکٹ ہوتے تو میں اس اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔''

یہ سن کر ضرار خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا۔ ''کیوں نہ پاکستان سے جا کر چند بم لے آئیں؟''

بلال نے پوچھا۔ ''بم انارکلی بازار میں بکتے ہیں یا کوئی سبزی فروش اپنی ریڑھی پر لاد کر ''بم لے لو بم'' کی آوازیں لگاتا پھرتا ہے؟''

''میری مراد ہے، فوج سے لے لیں۔'' ضرار نے جھینپ کر کہا۔

''فوج ہمیں راکٹ دے دے گی؟'' بلال نے ہنس کر کہا۔

''ہم ان کو یقین دلائیں گے کہ ہم ان راکٹوں کو نیک مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔'' ضرار نے کہا۔

''تمھارا اعتبار کرتا کون ہے؟'' بلال نے کہا۔

ضرار کچھ کہنے لگا تھا کہ چاچی نے غصے سے دونوں کی طرف دیکھا اور وہ خاموش ہو گئے۔

''میرے خیال میں سب سے پہلے تو ہمیں جہاز کے انجنوں کے بارے میں کچھ کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ پھر شعاعیں ڈالنا شروع کر دیں جس سے انجن خراب ہو جائیں۔'' ندیم بولا۔

بلال نے کہا۔ ''لالہ غنی نے کہا تھا کہ دافع برق پانی مل دینے سے انجن پر ان شعاعوں کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔''

''یہ تو درست ہے۔'' ندیم بولا۔ ''لیکن اگر پانی نے کام نہ کیا تو کیا ہو گا؟''

''جب تک کوئی دوسرا انتظام نہیں ہو جاتا، ہمیں چاہیے کہ اسی پانی کو انجنوں پر ملیں۔ یہاں روشنی کافی ہے۔ اس لیے ہم یہ کام آسانی سے کر لیں گے۔'' بلال نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ چلو یہی سہی۔'' ندیم نے کہا۔ ''آؤ جہاز کے انجنوں پر پانی ملیں۔'' انھوں نے غنی کی دی ہوئی بوتل سے پانی

نکال نکال کر انجن کے تمام پرزوں پر ملنا شروع کر دیا۔ چوں کہ ان کے پاس برش نہیں تھے اور وہ ہاتھوں سے پانی مل رہے تھے اس لیے ان کو بڑی محنت کرنا پڑی۔ کہیں آدھی رات کے قریب وہ اس کام سے فارغ ہوئے۔ اچانک آصف نے اعلان کیا کہ لالہ غنی ہوش میں آ گئے ہیں اور اب ان کے بچ جانے کی امید سو فی صد ہے۔ سب نے آصف کو مبارک باد کہا۔

بلال نے ہاتھ سونگھتے ہوئے کہا۔ ''اس پانی کو ملنے کے بعد ہاتھوں سے عجیب طرح کی بو آ رہی ہے۔ آیئے کیپٹن، ہاتھ دھو لیں۔''

''کیوں؟ دھوئیں کیوں؟ رہنے دو یونہی۔ تم نے سنا نہیں تھا لالہ غنی سے کہ اس کو ہاتھوں پر مل لینے سے بجلی کا جھٹکا نہیں لگتا۔'' ندیم بولا۔ وہ اٹھ کر غنی کے پاس گئے جو جہاز کے اندر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ آہٹ سن کر اس نے منہ اس طرف کر لیا اور آنکھیں کھول کر کہنے لگا۔

''کیا میں ابھی تک زندہ ہوں؟''

''تو پھر یہ کون بول رہا ہے؟'' ندیم نے مسکرا کر کہا۔

''آصف کی دوا سے آپ ایک دفعہ پھر سے جوان ہو جائیں گے۔''

''آہ! پشاور، قصہ خوانی بازار۔'' عبدالغنی نے اداس ہو کر کہا۔

''خو چے فکرمت کرو غنی لالہ، اَم آپ لوگ کو قصہ خوانی بازار ضرور لے جائے گا۔ اب اَم لوگ کو آپ ہنس کر دکھائے گا۔'' ندیم نے پٹھانوں کی طرح اردو بولتے ہوئے کہا اور غنی سمیت سب ہنس پڑے۔

غنی اٹھ کر بیٹھ گیا اور ندیم سے کہنے لگا۔ ''اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

''سچ پوچھیے تو ہمیں کچھ پتا نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ ہوش میں آ جائیں تو کل صبح کو آپ کو ساتھ لے کر ہوائی جہاز پر اس سارے علاقے کا چکر لگاؤں اور ایک دفعہ یہاں کی بہت سی جگہیں دیکھ لوں۔ اگر انھوں نے حملہ کیا تو میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ جہاز پر سے بڑے بڑے پتھر ان پر برساؤں گا۔ پھر جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔''

''بالکل بالکل۔'' غنی مسکرا کر بولا۔ ''جو لوگ چاہتے ہیں کہ ان پر پتھر نہ برسیں، ان کو شیشے کے گھروں میں نہیں رہنا چاہیے۔''

''شیشے کے گھر کیوں؟'' ندیم نے پوچھا۔

''اس لیے۔'' غنی نے کہا۔ ''کہ شیشے میں سے بجلی کا کرنٹ نہیں گزر سکتا۔ یہ لوگ شیشے کو پگھلا کر اس میں دافعِ برق پانی ملا دیتے ہیں جس سے شیشے کا رنگ پیلا ہو جاتا ہے۔ ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ ان کو بجلی کا ڈر نہیں رہتا، اور دوسرے یہ کہ رات کے وقت کوہِ نور کی روشنی ان کے گھروں میں داخل نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ لوگ ایسا نہ کریں تو تھوڑے ہی عرصے میں کوہِ نور کی روشنی سے اندھے ہو جائیں۔ اگرچہ شیشہ فولاد کی طرح سخت ہوتا ہے لیکن جب ٹوٹتا ہے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔''

''لیکن آپ یہ بتائیں کہ ان پر حملہ کیسے کیا جائے؟ کیا رائفل ٹھیک رہے گی؟'' ندیم نے پوچھا۔

''رائفل سے تو آپ ان کے چند ایک ہی مکان توڑ سکیں گے۔ اڈا تو پھر بھی قائم رہے گا۔'' غنی نے جواب دیا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ نہیں ہے کہ سب کو ختم کر سکیں۔'' ندیم بولا۔ ''میرے خیال میں تو ہوائی جہاز میں بڑے بڑے پتھر بھر کر ان پر برسائے جائیں۔ کیسا رہے گا؟''

''بلندی سے پتھر برسا کر آپ ان کو کافی نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن شاید آپ نے بتایا تھا کہ آپ کے پاس فقط اتنا پٹرول ہے جس سے آپ واپس گھر جا سکیں۔ ایسی صورت میں تو آپ کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ پھر ایک اور بات بھی ہے کہ جہاز سے آپ ان کے مکان تو توڑ سکیں گے، اڈے کو تباہ نہیں کر سکیں گے۔''

ندیم سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ''اچھا لالہ، اس سکیم کے بارے میں اب کل صبح ہی کچھ سوچیں گے۔''

ضرار باہر چٹان کی چھت پر تھا۔ اچانک وہ بھاگتا ہوا آیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ندیم نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''کیپٹن، یہ تتی ہمیں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ضرار نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی ابھی اس چٹان کی سیڑھیوں سے ہو کر آیا ہوں۔ وہ اس چٹان میں برمے سے چھید کر کے اچانک چھت پر آ جانا چاہتے ہیں۔''

ندیم نے غنی سے کہا۔ ''کیا ان لوگوں کے پاس برمے بھی ہیں؟''

''ان کے پاس برمے ہیں۔'' غنی نے کہا۔ ''جن کی نوک پر ریڈیم لگی ہوئی ہے۔ ریڈیم کی وجہ سے یہ برمے پتھر میں سے بھی اس طرح گزر جاتے ہیں جس طرح چاقو مکھن کی ٹکیا سے گزر جاتا ہے۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس بندوق، رائفل یا مشین گن وغیرہ نہیں ہے۔''

''میرے خیال میں ہمیں صرف باتیں ہی نہیں کرنی چاہئیں کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلانے چاہئیں۔ ورنہ وہ سرنگ لگا کر یہاں پہنچ گئے تو ہم مشکل میں پھنس جائیں گے۔'' ندیم نے کہا۔ ''غنی لالہ، آپ یہیں آرام فرمائیں۔ ہم ابھی واپس آتے ہیں۔ آصف آپ کے پاس رہے گا۔'' یہ کہہ کر ندیم، ضرار چاچی اور بلال نے رائفل، بندوق اور ریوالور اٹھائے اور جہاز سے نکل کر چٹان کی سیڑھیاں اترنے لگے۔ شور کی آواز چٹان سے کوئی سو گز کے فاصلے سے آ رہی تھی۔ نیچے آ کر سب اسی طرف چل پڑے۔

چٹان کے نیچے ایک گلی بنی ہوئی تھی۔ وہ گلی میں سو قدم کے قریب گئے ہوں گے کہ انھیں ایک جگہ سے گھرر گھرر کی آواز آئی مگر کوئی شخص نظر نہ آیا۔

''یہ آواز کس طرف سے آ رہی ہے؟'' ندیم نے آہستہ سے کہا۔

''سامنے سے۔'' ضرار نے کہا۔ ''میرے خیال میں یہاں کوئی غار ہے۔ وہ غار کے اندر ہی اندر سے ہم تک پہنچنا چاہتے ہیں۔''

سب غار کی دیوار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اچانک دیوار میں سے مٹی نکل نکل کر باہر گرنا شروع ہو گئی۔ ندیم نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش رہنے کے لیے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایک چھید دکھائی دینے لگا۔ ندیم آگے بڑھا اور اس نے اپنی رائفل کا منہ چھید میں رکھ کر غار کے اندر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ غار میں سے چند چیخوں کی آوازیں آئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

''آپ ذرا فاصلے پر کھڑے ہو جائیں۔'' ندیم نے کہا۔ ''ہر طرف خیال رکھیں۔ کچھ پتا نہیں کس وقت اور کس طرف سے کن کھجورے یا نیلی شعاعیں ہم پر حملہ کر دیں۔''

بیس منٹ تک سب خاموش کھڑے رہے لیکن کچھ نہ ہوا۔ آخر ندیم بولا۔ ''میں ان چھوٹی چھوٹی جھڑپوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں پاکستانی ہوں اور پاکستانی چوروں کی طرح چھپ کر لڑنے کے بجائے کھلے میدان میں للکار کر لڑنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہم میں سے ایک شخص یہاں ٹھہرے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات دیکھے تو ہمیں خبر کر دے۔ ہم اوپر لالہ غنی کے پاس جاتے ہیں۔''

ضرار وہاں ٹھہر گیا اور باقی لوگ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چٹان کی چھت پر آ گئے۔ ابھی وہ اوپر آئے ہی تھے کہ سیڑھیوں میں سے ضرار کی آواز آئی۔ ''کیپٹن، اس چھید میں سے کسی شخص کی آواز آ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ ہم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''غنی لالہ۔'' ندیم نے کہا۔ ''آپ ان لوگوں کی بولی سمجھتے ہیں۔ کیا آپ ساتھ نیچے تک چلیں گے؟''

''کیوں نہیں۔'' غنی نے کہا اور اٹھ کر چھید کے پاس آ گیا۔ ندیم نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چھید کے منہ میں رائفل کی نالی پھنسا دی۔ اچانک غار میں سے کسی کے بولنے کی آواز آئی اور غنی اس سے باتیں کرنے لگا۔ دونوں طرف سے چوں چوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد غنی نے ندیم کی طرف منہ کر کے کہا۔ ''وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ لوگ آج صبح سے پہلے پہلے یہاں سے چلے جائیں اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کریں تو یہ آپ کو اور نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''یہ ہمیں اور نقصان نہیں پہنچائیں گے؟'' ندیم نے غنی سے کہا۔ ''ان سے کہیے کہ ابھی تک تم نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔''

غنی نے وہی بات ان تک پہنچا دی۔ ایک منٹ باتیں کرنے کے بعد غنی نے ندیم سے کہا۔ ''وہ کہتے ہیں آپ ان کے سردار چنگ فرنگ سے بات کرنا پسند کریں گے؟''

''کہاں؟'' ندیم نے پوچھا۔

''ان کے محل میں۔'' غنی نے کہا۔

''نہیں! ان سے کہو اگر وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے تو یہیں اسی غار کے اندر آ کر اس چھید میں سے بات کر لے۔ میں اپنے آپ کو کن کھجوروں کی خوراک نہیں بنانا چاہتا۔'' غنی نے ان سے باتیں کرنے کے بعد ندیم سے کہا۔ ''وہ کہتے ہیں اگر تم لوگ واپس

نہ گئے تو وہ تم پر نیلی شعاعوں سے حملہ کر دیں گے۔''

ندیم نے کہا۔ ''ان سے کہہ دیجیے کہ جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو، کر دیکھو۔ اس سے پہلے کہ تم ہم پر حملہ کرو، ہم تمھارے شیشے کے گھروں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے۔'' غنی نے ان سے بات کی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ تبھی واپس چلے گئے تھے۔

''انھوں نے اور کیا کہا تھا؟'' ندیم نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' غنی نے کہا۔ ''وہ حیران تھے کہ میں ابھی تک زندہ کیسے ہوں۔ ان کے حساب سے مجھے اب تک مر جانا چاہیے تھا۔ جاتی دفعہ وہ کہہ گئے ہیں کہ وہ ہمیں تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔''

''میں اب سمجھا۔ یہ ہمیں زندہ پکڑنے کے لیے آئے تھے تاکہ ہمیں عذاب دے دے کر ماریں۔ چلیے چلیں۔'' ندیم نے کہا اور وہ گلی میں سے ہوتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھنے لگے اور پھر چٹان کی چھت پر آ گئے۔ ندیم غور سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دُور کے فاصلے پر انھیں ایک چوٹی نظر آئی۔ ''غنی لالہ، یہ چوٹی ہماری چٹان کی چھت سے بلند ہے نا؟'' ندیم نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' غنی نے کہا۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اسی چوٹی سے ایک نیلی شعاع اندھیرے کو چیرتی ہوئی آئی اور شاہین پر پڑی۔ ندیم نے ''لیٹ جاؤ'' کہا اور سب زمین پر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ایک شعاع اور آئی اور وہ پھر زمین پر لیٹ گئے۔ شعاع جہاز سے ٹکرا کر واپس چلی گئی۔ ''غنی لالہ۔'' ندیم نے کہا۔ ''اگر یہ نیلی شعاعیں جہاز سے ٹکراتی رہیں تو اس پر کیا اثر ہوگا؟''

''اگر ایک گھنٹے تک لگاتار یہ شعاعیں کسی دھات پر پڑتی رہیں تو اس کو سرمہ بنا دیتی ہیں اور دھات اس طرح کی ہو جاتی ہے جیسے بسکٹ ہو۔'' ندیم نے خوف زدہ نظروں سے غنی کو دیکھا اور کہا۔ ''غنی لالہ، ہمارا جہاز تو سارے کا سارا دھات کا بنا ہوا ہے۔''

''تب تو یہ بات بہت بُری بات ہوئی۔'' غنی نے کہا۔

''ندیم نے نیلی شعاعوں والی چوٹی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''وہاں سے نیلی شعاعیں نکلتی ہیں۔ چاچی مجھے کارتوس اور بندوق دیجیے۔''

''تم کرنا کیا چاہتے ہو؟'' چاچی نے بندوق پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

''اس چوٹی پر فائر کروں گا جہاں سے یہ نیلی شعاع آتی ہے۔'' ندیم نے جواب دیا۔

''لیکن جو آدمی پھینک رہے ہیں۔'' غنی نے کہا۔ ''وہ تو چھپے ہوئے ہوں گے۔ انھیں تمھاری گولی نہیں لگ سکتی۔''

''اگر میں اس آدمی کو ہلاک نہ کر سکا جو یہ شعاعیں ڈال رہا ہے تو کم از کم شعاعیں پیدا کرنے والی ٹارچ کو تو توڑ دوں گا۔'' ندیم نے کہا۔ یہ کہہ کر اس نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ روشنی ایک دم غائب ہو گئی۔

''وہ مارا!'' ندیم نے خوشی سے چلاّتے ہوئے کہا۔

''کیا ٹارچ ٹوٹ گئی؟'' چاچی نے پوچھا۔

''ٹوٹی نہیں، لیکن بجھی ضرور ہے۔'' ندیم بولا۔

''توڑ دو تب مزہ ہے۔'' چاچی نے کہا۔

''میرے خیال میں چوٹی میرے اندازے سے زیادہ دُور ہے۔'' ندیم نے کہا۔ ''اچھا میں پھر کوشش کرتا ہوں۔''

ابھی وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ نیلی روشنی پھر نظر آنے لگی۔ ندیم نے بار بار فائرنگ کی مگر روشنی تھوڑی دیر کے لیے بجھتی اور پھر جل اٹھتی۔ آخر ندیم بولا۔ ''روشنی یہاں سے بہت دُور ہے۔ میں یونہی کارتوس ضائع کرتا رہا، کیوں نہ یہ جگہ چھوڑ کر اسی جگہ چلے جائیں جہاں ہم نے پہلے خیمہ لگایا تھا؟''

''آپ کا خیال ہے کہ وہاں ہم اس روشنی سے بچ جائیں گے؟ وہ کھلی جگہ ہے وہاں روشنی اور آسانی سے آ سکتی ہے۔'' غنی نے کہا۔

''محفوظ جگہ تو پھر ایک ہی ہے یعنی اوپر ہوا میں اُڑ جائیں۔'' ندیم نے کہا۔ ''لیکن میں پٹرول کو ان بے کار قسم کی چیزوں میں ضائع نہیں کر سکتا۔''

ندیم نے ایک بار پھر ٹارچ پر گولیاں چلائیں مگر وہ اتنی دُور تھی کہ گولی وہاں تک پہنچ ہی نہ سکی۔ اچانک ایک تیز شعاع آئی اور سب جلدی سے زمین پر لیٹ گئے۔

''غنی لالہ! ان کے پاس نیلی شعاعیں پھینکنے والی کتنی ٹارچیں ہیں؟'' ندیم نے پوچھا۔
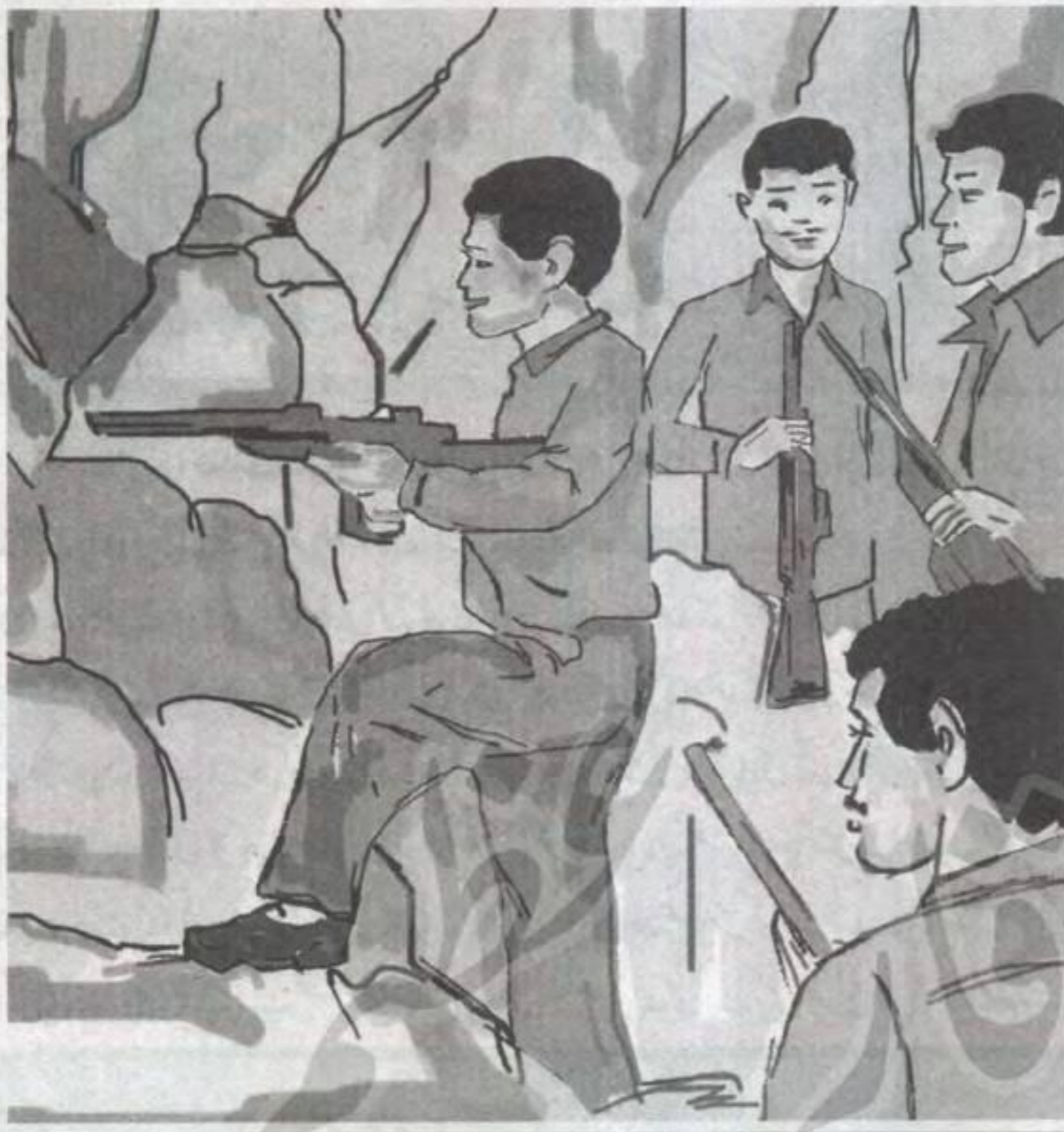
''سینکڑوں۔'' غنی نے کہا۔ ''کچھ تو جیبی ہیں اور ایک بہت بڑی ٹارچ ہے جو وہ سامنے کی چوٹی پر لگی ہوئی ہے لیکن اس کے استعمال کا موقع کبھی کبھار ہی آتا ہے، کیوں کہ عام طور پر اس جگہ پر لوگ نہیں آتے۔ یہ بے حد خطرناک ہے۔''

''اگر وہ چوٹی والی ٹارچ تباہ ہو جائے تو پھر کئی دنوں تک ہم ان شعلوں سے چھٹکارا پا لیں گے۔'' چاچی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''اس چوٹی کا راستہ ہے کس طرف؟'' ندیم نے پوچھا۔

اچانک چوٹی سے ایک شعاع پھر نکل کر آئی، اور شاہین پر پڑی۔ سب لیٹ گئے تھے۔ غنی نے ندیم کو چوٹی کا راستہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''اس چھت کے اسی طرف جس طرف یہ کوہِ نور ہے، ایک راستہ بنا ہوا ہے۔ یہ راستہ بل کھاتا ہوا بہت دُور ایک شہر کی طرف جا نکلتا ہے۔ بہر حال آپ کو یہاں سے تقریباً آدھے میل کے فاصلے پر دائیں ہاتھ چوٹی پر جانے والی سیڑھیاں نظر آئیں گی۔ مجھے یہی ایک راستہ معلوم ہے۔''

''کیا اس چوٹی کے پرے کوئی ایسی جگہ ہے جہاں شعاعیں نہ پہنچتی ہوں اور وہاں ہم جہاز بھی آسانی سے اتار سکیں۔'' ندیم نے پوچھا۔

''ہاں۔'' غنی نے کہا۔ اس چوٹی کی دوسری جانب ایک بڑا سا میدان ہے جہاں ہم جہاز کھڑا کر سکتے ہیں۔ کاش! ہم وہاں پہنچ سکیں۔''

اتنے میں پھر ایک شعاع آئی۔ سب لیٹے ہوئے تھے۔ جہاز کو جب شعاع چھوتی تو ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوتی۔

''اگر شعاعیں یوں ہی آتی اور جہاز سے ٹکراتی رہیں تو جہاز تباہ ہو جائے گا۔'' ندیم نے کہا۔ ''ہمیں سب سے پہلے اس چوٹی کی ٹارچ بجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

ندیم تیزی سے سوچنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے ایک ترکیب سوجھ گئی تھی۔ شعاعیں بار بار آ کر جہاز سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے ضرار سے کہا۔ ''ذرا مجھے وہ ریشمی رسی جہاز سے لا دو جو ہم پہاڑیوں پر اترنے چڑھنے کے لیے لائے ہیں۔ تین سو گز لمبی رسی ہے۔ میرے خیال میں یہ چٹان مشکل سے دو سو گز اونچی ہوگی اور بلال تم ان سب کو جہاز میں بٹھا کر اس جگہ پہنچو۔ جہاں ہم نے آ کر خیمہ گاڑا تھا۔ وہاں روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ اگر وہاں بھی پہنچ جائے تو جہاز کو اُڑا کر کسی اور جگہ لے جاؤ۔ بس صبح تک اس روشنی سے بچو۔ صبح مجھے اور ضرار کو اس چوٹی کی دوسری جانب والے کھلے میدان میں ملو۔ ہم دونوں اس چوٹی والی ٹارچ کو بجھانے جا رہے ہیں۔''

ضرار دوڑ کر ریشمی رسی لے آیا۔ ندیم نے رائفل اور ضرار نے بندوق میں گولیاں بھریں۔ رسی چٹان سے نیچے لگا دی گئی۔ سب نے مل کر مضبوطی سے اسے پکڑ لیا۔

''بلال!'' ندیم نے کہا۔ ''لالہ غنی، چاچا اور آصف کو خدا کے بعد تمھارے سپرد کر رہا ہوں۔ خوب ہوشیار رہنا۔ بس چند گھنٹے کی تکلیف ہے۔ پھر ان شاء اللہ نیلی روشنی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔''

''فکر نہ کریں کیپٹن۔'' بلال نے کہا۔

''خدا حافظ!'' ندیم نے کہا اور رسی پکڑ کر بجلی کی سی تیزی سے چٹان سے نیچے اتر گیا۔ اس کے بعد ضرار بھی نیچے آ گیا۔ (باقی آئندہ)

# کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

حضرت علیؓ کی خدمت میں دو آدمی پیش ہوئے۔ ان کا جھگڑا بڑا عجیب تھا۔ دونوں ایک جگہ دوران سفر اکٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان میں ایک کے پاس پانچ روٹیاں تھیں اور دوسرے کے پاس تین۔ اتنے میں ایک مسافر آیا۔ ان دونوں نے اسے بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔ اجنبی الگ ہوتے ہوئے ان دونوں کو آٹھ درہم دے گیا اور کہا کہ آپس میں بانٹ لینا۔

مسافر تو یہ کہہ کر چلا گیا مگر ان دونوں میں آٹھ درہم کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا۔ پانچ روٹیوں والا خود پانچ درہم لینا چاہتا تھا اور دوسرے شخص کو تین درہم دینا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میری پانچ روٹیاں تھیں اور تمہاری تین، اس لیے پانچ درہم میرے اور تین تمہارے مگر دوسرا شخص کہتا تھا کہ مسافر نے ہم دونوں کا کھانا کھایا ہے، لہٰذا دونوں کو چار چار درہم ملنے چاہئیں۔ حضرت علیؓ نے جب سارا قصہ سنا تو آپؓ نے تین روٹیوں والے سے کہا۔ ''بھلے آدمی، تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ تم تین ہی درہم قبول کر لو۔ حساب کیا جائے تو تمہارے حصے میں صرف ایک درہم آتا ہے۔''

پیارے بچو! آپ اپنے علم کے مطابق بتائیں کہ حضرت علیؓ نے کس طرح اس معاملہ کو نمٹایا۔
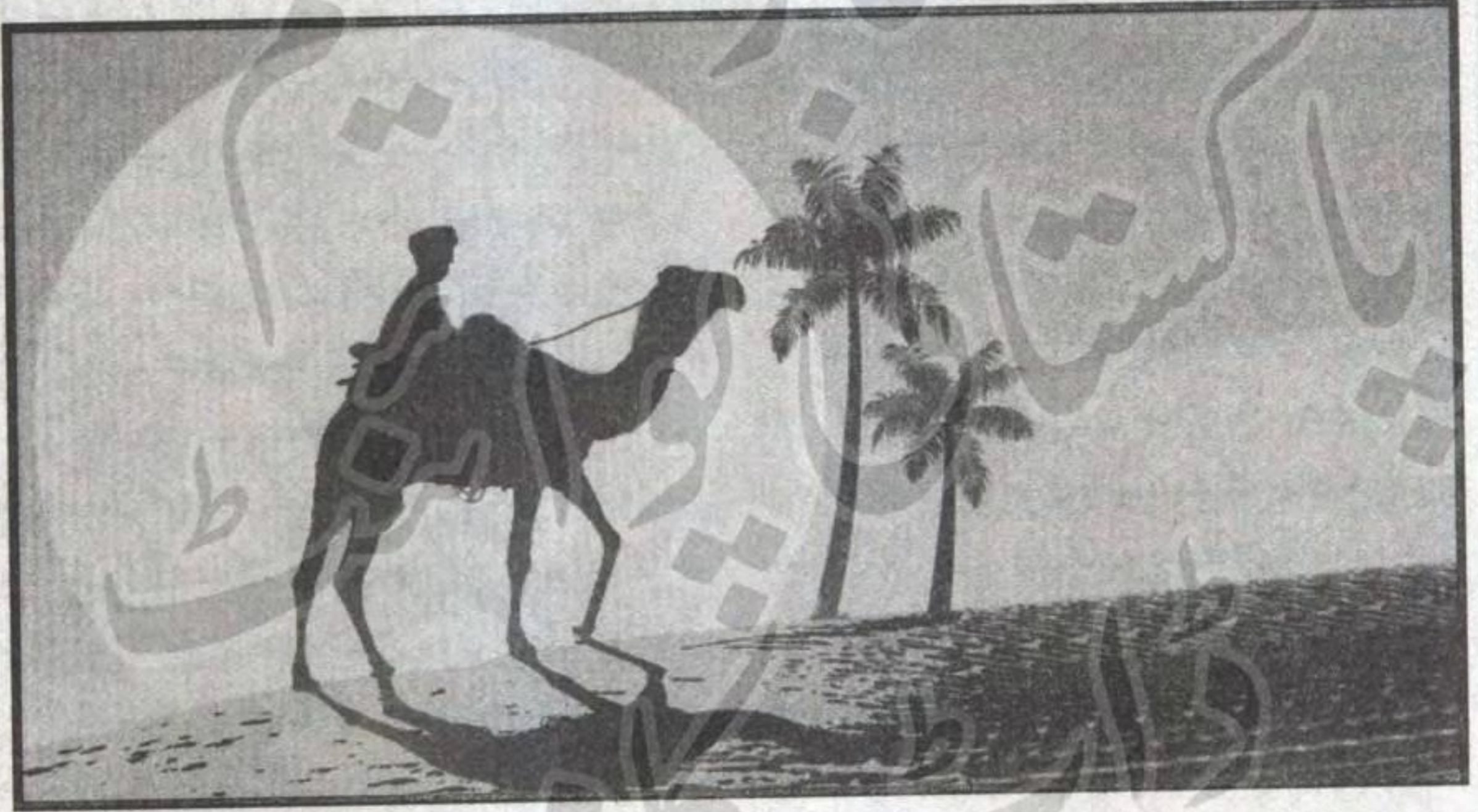
ستمبر 2013ء میں شائع ہونے والے ''کھوج لگائیے'' کا صحیح جواب یہ ہے: میجر عزیز بھٹی شہید۔

ستمبر 2013ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1۔ محمد شادمان صابر، لاہور
2۔ حافظ حبیب اللہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ
3۔ نور فاطمہ قادری، کامونکی
4۔ انیس الرحمٰن، گوجرانوالہ کینٹ
5۔ زین خان، سرگودھا۔

## والدین کا حق

(عائزہ جاوید، مرید کے)

رات کے قریباً گیارہ بجے تھے۔ میاں جی اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے لیمپ کی روشنی میں کتاب پڑھ رہے تھے۔ میاں جی محلے کے بزرگ آدمی تھے۔ ہر اتوار کی شام کو محلے کے نوجوانوں کو گھر میں دعوت دیتے اور انہیں اخلاقی اقدار کا درس دیتے۔ میاں جی کا کمرا گلی کی سمت میں تھا۔ اچانک قدموں کی آہٹ نے انہیں متوجہ کر لیا۔ اپنی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو دور سے کوئی نوجوان چلتا ہوا دکھائی دیا۔ میاں جی کمرے سے باہر نکلے اور گھر کا دروازہ کھول کر اس نوجوان کو دیکھنے لگے۔ ایک نوجوان میلے کپڑوں میں ملبوس کچھ گنگناتا ہوا آ رہا تھا۔ میاں جی کو دیکھ کر رک گیا اور سلام کیا۔ میاں جی بولے ''عبدالکریم یہ کس وقت گھر جا رہے ہو؟ پتر جلدی گھر جایا کرو اور سویرے جلدی اٹھا کرو۔ چار دن کی زندگی ہے کیوں گنوا رہے ہو؟'' ''اچھا میاں جی! ہر روز یہی کہتے ہیں۔ ابھی تو مجھے نیند آ رہی ہے باقی نصیحت صبح سن لوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے نوجوان آگے کی جانب بڑھ گیا لیکن میاں جی لڑکے کو دل میں دُعائیں دیتے ہوئے اندر چلے گئے۔ عبدالکریم کا گھر اس محلے کے آخر میں تھا۔ جیب سے چابی نکالی اور دروازے پر لگا ہوا پرانا سا تالا کھولا۔ گھر ویران سا لگتا تھا۔ ایک بڑا سا برآمدہ اور پیچھے دو کمرے تھے۔ عبدالکریم اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ایک نگاہ دیوار پر امی، ابا کی لگی ہوئی تصویر پر ڈالی اور بستر پر لیٹ گیا۔ نیند نے اپنی آغوش میں فوراً اس طرح لے لیا کہ جیسے کافی مدت سے سویا نہ ہو۔ کچھ دیر بعد دروازے پر مسلسل دستک نے نوجوان کو جگا دیا۔

عبدالکریم منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اٹھا: ''لوگوں کو رات کا احساس نہیں ہے۔ کسی کی نیند کا خیال نہیں۔ نجانے اس دنیا کو چین کیوں نہیں ہے۔'' اَدھ کھلی آنکھوں سے دروازہ کھولا۔ دروازے پر کھڑے دو بزرگوں کو دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ منہ سے الفاظ بمشکل نکلے: ''آپ..... آپ یہاں؟ آپ تو جا چکے تھے؟'' سفید کپڑوں میں ملبوس بوڑھی عورت نے کہا: ''اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے۔'' نوجوان پیچھے ہٹ گیا۔ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت گھر میں داخل ہو گئے۔ بوڑھی عورت نے ایک نظر عبدالکریم کی طرف ڈالی اور آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ بولی: ''عبدالکریم کیا ہم تمہیں یاد نہیں آتے ہیں۔ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ تمہارے چہرے پر کتنی ویرانی ہے۔ یہ گھر کتنا سنسان ہے۔ بیٹا ہم تمہیں نہیں بھولے۔ ہم تمہیں ملنے آ گئے ہیں لیکن تم نہیں آتے۔'' عبدالکریم دونوں بزرگوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ بوڑھے مرد نے جوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''عبدالکریم جب تم چھوٹے تھے ہم نے کبھی تجھے اکیلا نہیں چھوڑا تھا کہ تجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے مگر تو ہمیں کہاں چھوڑ آیا ہے۔ دیکھو گھر کو کتنا گندا بنا رکھا ہے۔'' بوڑھے مرد نے اپنی انگلی سے برآمدے کی جانب اشارہ کیا۔ ''گھر رات کو دیر سے آتا ہے۔ سورج کی تپش میں دن گزارتا ہے تو گھنی چھاؤں میں کیوں نہیں بیٹھتا۔ تو بولتا کیوں نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے دونوں بزرگ دروازے سے باہر جانے لگے تو نوجوان رونے لگا۔ سسکیاں بھرتے ہوئے بولا: ''اماں کہاں جا رہی ہو؟ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ ابو جی رُک جاؤ۔ مجھے معاف کر دو۔'' لیکن دونوں بزرگ اندھیرے میں ہی غائب ہو گئے۔ اسی دوران عبدالکریم کی آنکھ کھل گئی۔ وہی کیفیت، جسم پسینے سے شرابور، بستر سے اٹھا اور دروازے کی جانب دوڑا لیکن دروازہ بند تھا۔ فضا میں خاموشی چھائی تھی۔ عبدالکریم برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اذانِ فجر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ عبدالکریم کے قدم خود بخود مسجد کی جانب اٹھے۔ مسجد میں نماز کے بعد باہر آ کر بیٹھ گیا۔ میاں جی مسجد سے باہر نکلے۔ ان کی نظر عبدالکریم پر پڑی۔ ''کیا ہوا ہے؟ خیریت تو ہے؟'' میاں جی نے اضطراب سے پوچھا، نوجوان روتے ہوئے

بولا۔ ”اماں اور ابا خواب میں آئے تھے۔ روٹھے ہوئے تھے۔ کہتے تھے کہ میں ملنے نہیں جاتا۔“ یہ کہتے ہوئے نوجوان نے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ میاں جی نے عبدالکریم کو دلاسا دیتے ہوئے کہا: ”عبدالکریم! والدین کا بھی تجھ پر حق ہے۔ اگر وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تو تم ان کی مغفرت کی دُعا کرو۔ ان کی قبر پر جاؤ۔ رات کو جواب میں وہ تمہیں یہی کہہ رہے تھے۔ ہماری قبروں پر آ کر دُعا کیا کرو۔“ نوجوان سر جھکائے میاں جی کی باتیں سن رہا تھا۔ سورج طلوع ہو گیا۔ اس کی کرنیں ہر طرف پھیل گئیں۔ میاں جی نے عبدالکریم کو گلے لگایا۔ عبدالکریم آنسو پونچھتے ہوئے قبرستان کی جانب چل دیا۔

(پہلا انعام: 120 روپے کی کتب)

## اندازِ نصیحت

(ثمرہ کرن، اسلام آباد)

قاسم اپنے کمرے میں اُداس بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اس وقت شدید غصہ آ رہا تھا۔ ایک حسد کی آگ تھی جو اس کے دل میں لگی ہوئی تھی اور اس کی روح کو جلا رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہر دفعہ یہ انعام احمد ہی کو کیوں ملتا ہے؟ اس نے آج کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اسکول سے گھر آ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور اپنا بستہ ایک طرف پھینک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی امی اس کے کمرے میں آ گئیں۔

”کیا بات ہے قاسم بیٹا؟“ اس کی امی نے پوچھا۔

”امی اس دفعہ پھر احمد کو اچھی نصیحت کرنے کا انعام ملا ہے۔“ قاسم نے جواب دیا اور ساتھ ہی رونے لگ گیا۔ اس کی امی اس کو چپ کرانے لگ گئیں۔

قاسم اور احمد دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا تھا جس کا نام ”خوب صورت اندازِ نصیحت“ تھا۔ دسویں جماعت کے دو سیکشن تھے اور ہر سیکشن سے ایک ایک بچے کا انتخاب ہوتا تھا۔ پھر وہ دونوں سیکشن ہفتے میں ایک دن بچوں کو کوئی نصیحت کرتے۔ پھر پورا ہفتہ دیکھتے کہ کس طالب علم کی نصیحت پر بچوں نے زیادہ عمل کیا ہے۔ اس طرح ایک مہینے میں وہ دونوں سیکشن چار مرتبہ بچوں کو نصیحت کرتے اور مہینے کے اختتام پر جس طالب علم کی نصیحت پر بچے سب سے زیادہ عمل کرتے اسے انعام ملتا۔ اس سلسلے کو شروع ہوئے چار مہینے ہو چکے تھے۔ اس سے ایک تو طلباء بات چیت کے آداب سیکھتے اور دوسرا چھوٹے طلباء کی عادتیں بھی ان نصیحتوں پر عمل کرنے سے اچھی ہوتیں۔ قاسم کی کلاس نے اسے ہی نصیحت کرنے کے لیے چنا تھا اور شروع شروع میں وہ اس پر بہت خوش بھی تھا مگر چار بار مسلسل انعام نہ ملنے کی وجہ سے وہ بہت غمگین ہو گیا تھا۔

☆☆

”قاسم تم نے عامر (قاسم کا چھوٹا) کو کیوں ڈانٹا ہے؟“ قاسم ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کر رہا تھا کہ اس کی امی نے غصے میں اس سے پوچھا۔ وہ پہلے تو بہت حیران ہوا، پھر اس نے جواب دیا: ”امی وہ مجھے پڑھنے نہیں دے رہا تھا اور بہت تنگ کر رہا تھا، اس لیے مجھے اس پر غصہ آ گیا۔“

”تمہیں شرم نہیں آتی۔ اپنے سے چھوٹوں کو کوئی ڈانٹتا ہے؟ میں نے تمہیں کتنی دفعہ سمجھایا ہے کہ چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آیا کرو۔ تمہیں میری بات کی سمجھ نہیں آتی؟“ امی قاسم پر غصے سے چلاّ رہی تھی اور وہ حیرت اور پریشانی سے امی کو دیکھ رہا تھا۔ پریشانی میں اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی امی نے آج سے پہلے کبھی اس سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ اسے ہر بات بہت پیار سے سمجھاتی تھیں۔ پھر یہ آج انہیں کیا ہو گیا تھا؟ آج ان کے لہجے میں اس قدر تبدیلی دیکھ کر وہ حیران اور پریشان ہو گیا تھا۔ صرف اس دن ہی نہیں بلکہ اس کے بعد ہر دن امی اسے کسی نہ کسی بات پہ ڈانٹتیں۔ بعض اوقات تو اسے بہت بُرا لگتا۔ وہ سوچتا کہ امی کو میری عزت کا کوئی خیال نہیں ہے۔ وہ سب کے سامنے مجھے اتنی بُری طرح ڈانٹ دیتی ہیں۔ وہ ہر بات مجھے اتنے غصے سے کیوں سمجھاتی ہیں۔ ایک دن اس سے مزید برداشت نہ ہوا تو وہ رونے لگ گیا۔ اس کی امی کو اس کے کمرے سے رونے کی آواز آئی تو وہ اس کے کمرے میں گئیں۔ انہوں نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے ساری بات بتا دی۔ انہوں نے سوچا کہ اب بہت ہو گیا، اب میں قاسم کو بتا دیتی ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ وہ بولیں: ”تمہیں یاد ہے کہ ایک ہفتہ پہلے جب تمہیں ”خوب صورت اندازِ نصیحت“ کا انعام ملا تھا تو تم رونے

لگ گئے تھے۔ بس میں نے اسی دن ارادہ کر لیا تھا کہ اب تمہیں دوسرے طریقے سے سمجھاؤں گی۔'' ''کیا مطلب؟'' قاسم نے حیرت سے اپنی امی کی طرف دیکھا۔ ''بتاتی ہوں۔'' امی نے جواب دیا۔ ''بیٹا! تمہیں اچھی نصیحت کرنے کا انعام اس لیے نہیں ملا کیوں کہ تمہاری نصیحت تو بہت اچھی ہوتی ہے مگر تمہارا انداز اچھا نہیں ہوتا۔ جب تم نصیحت کر رہے ہوتے ہو تو اس وقت تم میں ایک غرور ہوتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور باقی سب چھوٹے۔ تم اکثر نصیحت کرتے ہوئے بچوں کو بُرا بھلا کہہ دیتے ہو۔ جو انسان غرور کرتا ہے دوسروں کے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ تمہیں دوسروں کو نصیحت اس انداز میں کرنی چاہیے کہ ان کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو اور وہ اسے اپنی بے عزتی نہ سمجھیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان جو بھی نصیحت کرے خود بھی اس پر عمل کرتا ہو۔ میں تم سے چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنے کے لیے کہہ رہی تھی مگر میں خود تم سے شفقت سے پیش نہیں آئی تو تم پر میری بات کا کیا اثر ہوا ہو گا؟ اس کی مثال میں تمہیں اس طرح دیتی ہوں۔'' امی نے اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں کوئی کھانا پکاؤں اور اس کا ذائقہ اتنا خاص اچھا نہ ہو لیکن میں بظاہر اسے سجا کر تمہارے سامنے پیش کروں تو یقیناً تمہارا دل کرے گا کہ تم اسے کھاؤ۔ اس کے برعکس میں بہت عمدہ کھانا بناؤں مگر تمہیں اچھے طریقے سے پیش نہ کروں تو یقینی بات ہے کہ تم اسے کبھی نہیں کھاؤ گے، چاہے اس کا ذائقہ کتنا ہی اچھا ہو۔ احمد کو اسی لیے انعام ملا کہ وہ ایک عام بات بھی اس انداز میں کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے دل میں گھر کر جاتی ہے اور جب تم بات کر رہے ہوتے ہو تو اکثر کسی بھی بچے کو مخاطب کر کے ڈانٹ دیتے ہو۔''

''امی وہ تو میں اس لیے ڈانٹتا ہوں کہ وہ میری بات توجہ سے نہیں سن رہا ہوتا۔'' قاسم امی کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''بیٹا دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ڈانٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس طرح کرنے سے تو انہیں بُرا لگتا ہے۔ تم بات اس انداز سے کرو کہ دوسرا توجہ سے تمہاری بات سنے۔ بیٹا! زبان انسان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اگر اسے صحیح استعمال کیا جائے تو بڑے سے بڑے دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں۔'' امی نے جواب دیا۔

قاسم بولا: ''مگر امی میں بڑا ہوں۔ میں جس طرح مرضی بات کروں، ان کا فرض ہے میری بات ماننا۔''

امی نے جواب دیا: ''بیٹا میں بھی تو تم سے بڑی ہوں نا اور تمہاری ماں بھی ہوں مگر اس پورے ہفتے میں تمہیں میرا رویہ یقیناً بہت بُرا لگا ہو گا اور اس دوران میں نے تمہیں جتنی بھی باتیں کہیں شاید ہی تم نے کسی پر عمل کیا ہو، کیوں؟ اس لیے کہ میں نے تمہیں ہر بات غصے سے کہی۔ بیٹا! چھوٹوں کی بھی عزت ہوتی ہے۔ جس طرح ہم سے کوئی سخت لہجے میں بات کرے تو ہمیں بُرا لگتا ہے اس طرح انہیں بھی لگتا ہے اور پھر آپ ﷺ نے بھی تو ہمیں چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنے کے لیے کہا ہے۔ بے شک انہوں نے چھوٹوں، بڑوں کو عزت کرنے کے لیے کہا مگر اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ اس وقت تک ہماری بات تو غور سے نہیں سنیں گے اور ہماری عزت نہیں کریں گے جب تک ہم ان سے پیار سے بات نہیں کریں گے۔''

قاسم امی کی بات کو غور سے سن رہا تھا۔ بولا: ''جی امی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آئندہ سب سے اچھے انداز میں بات کروں۔''

تین ہفتے بعد قاسم اسکول سے گھر واپس ہوتے ہوئے بہت خوش تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہی خوشی سے بولا: ''امی، امی! آپ کہاں ہیں؟ یہ دیکھیں مجھے انعام ملا ہے۔'' اس کی آواز سن کر امی اس کے پاس آئیں تو وہ بولا: ''امی مجھے اور احمد دونوں کو ہی ''خوبصورت اندازِ نصیحت'' کا انعام ملا ہے کیوں کہ ہم دونوں کی باتوں پر بچوں نے بہت عمل کیا۔ اس لیے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہم دونوں کو ہی انعام کا حق دار قرار دیا۔'' امی نے خوشی سے اسے گلے لگا لیا۔

(دوسرا انعام: 100 روپے کی کتب)

## نومے کا دنبہ

(شائستہ انجم، واہ کینٹ)

شام کو دادا جان نے گھر داخل ہوتے ہوئے اپنی پوتی کو آواز دی۔ ''نومے نومے...... نومے بیٹا! جلدی آؤ۔'' نومے بھاگتی ہوئی آئی اور دادا جان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ وہ ایک بہت پیاری بچی تھی اور اپنے دادا جان کی بے حد لاڈلی بھی۔

دادا جان نے سب سے پہلے نومے کو خوش خبری سنائی کہ انہوں نے بقرعید کے لیے دُنبہ منتخب کر لیا ہے جو صبح تک آ جائے گا۔ دادا جان جانتے تھے کہ گھر میں نومے کو سب سے زیادہ بے چینی سے عید کے دُنبے کا انتظار ہے۔ لہٰذا دادا جان نے یہ خبر سب سے پہلے نومے کو ہی سنائی۔ نومے خوشی سے چلائی: ''دادا جان، زندہ باد!'' اور پھر بھاگ کر گھر کے پچھلے حصے میں چلی گئی اور وہاں سے دُنبے کے لیے بہت سی گھاس اٹھا لائی تاکہ صبح سے ہی اس کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ رہے۔ پھر اس نے دُنبے کے لیے خوب صورت جنگلی پھولوں کا ہار تیار کیا جو اس کے گھر کے پچھلے حصے میں باڑ کی صورت میں لگے تھے۔

صبح نومے کی آنکھ ''میں...... میں......'' سے کھلی۔ دیکھا تو ایک پیارا سا دُنبہ اس کے سرہانے کھڑا ہے۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھی اور دُنبے کو بہت پیار کیا کیوں کہ یہ دُنبہ اگر اس کے سرہانے ''میں...... میں......'' نہ کرتا تو اسے شاید اسکول سے دیر ہو جاتی۔ اس نے خود ناشتہ کیا اور دُنبے کو بھی چارہ دیا اور پھر اس کے اوپر سوار ہو کر اسکول کی طرف روانہ ہو گئی۔ تمام راستے راہ چلتے لوگ اسے رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی شاہی سواری پر سوار ہے اور کسی شہزادی سے کم معلوم نہیں ہو رہی۔ اس کا چھوٹا سا بستہ دُنبے کی گردن میں جھول رہا تھا اور پھر وہ شاہانہ طمطراق سے اسکول میں داخل ہوئی۔ اسکول کے ساتھی تو ساتھی، تمام اساتذہ حتیٰ کہ پرنسپل نے بھی نومے اور اس کے دُنبے کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا اور اس کے لیے راستہ چھوڑا۔

جماعت میں پہنچ کر نومے نے اپنے دُنبے کو اپنی میز کے نیچے بٹھا دیا۔ انگریزی کی مس بہت غصے والی تھیں۔ نومے سمیت تمام بچے ان سے بہت ڈرتے تھے۔ چنانچہ مس نے کلاس شروع ہونے کے بعد سب بچوں سے نظم سننا شروع کی جو انہوں نے گزشتہ دن یاد کرنے کے لیے دی تھی۔ جب نومے کی باری آئی تو اگرچہ اسے ساری نظم یاد تھی مگر گھبراہٹ میں ایک لائن بھول گئی۔ اس نے پریشان ہو کر نیچے دیکھا تو اس کے دُنبے نے نظم والی کتاب کا وہی صفحہ منہ میں دبایا ہوا تھا جہاں سے ساری نظم صاف اور واضح نظر آ رہی تھی۔ نومے کو جھٹ وہ لائن یاد آ گئی اور اس نے فرفر مس کو تمام نظم سنا دی اور شاباشی بھی حاصل کی۔ آدھی چھٹی کے وقت ہر بچے نے دُنبے کی خاطر تواضع کی۔ کسی نے چپس کھلائے، کسی بچے نے اپنے لنچ میں سے کچھ کھانے کو دیا۔ اسکول کے مالی نے بھی درخت سے کچھ پتے توڑ کر کھلائے۔ غرض نومے کے دُنبے کی خوب آؤ بھگت ہوئی اور ہر بچہ چاہتا تھا کہ نومے اپنا دنبہ کچھ دن کے لیے اسے دے دے مگر نومے نے صاف انکار کر دیا۔

اسکول سے چھٹی کے وقت دُنبے نے بغیر کہے نومے کا بستہ اپنے گلے میں ڈال لیا اور زمین پر اس طرح اگلی ٹانگیں موڑ کر بیٹھ گیا کہ نومے آسانی سے دُنبے پر بیٹھ سکے اور پھر اسکول سے واپسی کا شاہانہ سفر شروع ہوا اور ایک بار پھر تمام لوگ رشک بھری نظروں سے نومے کو دیکھ رہے تھے۔ آج دادا جان نے نومے کو جب دنبے سے کھیلتے دیکھا تو پیار سے کہا: ''بیٹے! جی بھر کر کھیل لو، پرسوں بقرعید ہے اور اس کی قربانی کا وقت آ گیا ہے۔'' یہ سن کر نومے کی آنکھوں میں دُکھ سے آنسو بھر آئے اور بولی: ''پیارے دادا جان! آپ قربانی کے لیے کوئی اور جانور لے آئیں نا!''

دادا جان نے نہایت محبت سے سمجھایا: ''بیٹا! بقرعید کو عید قربان اس لیے بھی کہتے ہیں کہ اس دن اللہ کی راہ میں قربانی کی جاتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے چہیتے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیا تو اللہ کو ان کی قربانی اتنی پسند آئی کہ ان کے بیٹے کی جگہ دُنبہ بھیج دیا۔ نومے پر دادا جان کی باتوں کا بے حد اثر ہوا اور وہ خوشی خوشی دُنبے کی قربانی کے لیے راضی ہو گئی۔ قربانی کے بعد دُنبے کے گوشت کے تین حصے کئے گئے۔ ایک حصہ پڑوسیوں، دوسرا ناداروں اور تیسرا رشتے داروں کے لیے مخصوص کیا گیا۔ پھر امی جان نے بقرعید کی خوشی میں دُنبے کا بے حد لذیذ نمکین گوشت تیار کیا، اور خاندان بھر کی دعوت کی۔ اب چونکہ سردیاں آ رہی تھیں۔ دادا جان نے نومے کو نہایت خوب صورت اونی سکارف لا کر دیا اور یہ بتا کر حیران کر دیا کہ یہ اونی سکارف اس کے دُنبے کے اون سے تیار کیا گیا ہے۔ نومے یہ خوب صورت تحفہ پا کر بہت خوش ہوئی اور جھٹ یہ اونی سکارف اوڑھ لیا۔ اب اس کا پیارا دُنبہ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ تھا کہ اچانک اسے ''میں...... میں......'' کی آواز آئی تو اس کی آنکھ فوراً کھل گئی اور اس کے سرہانے دادا جان دُنبے کے ساتھ کھڑے تھے۔ اگلی بقرعید کے لیے دُنبہ آ گیا تھا۔

(تیسرا انعام: 80 روپے کی کتب)

## مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

ستمبر کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ میں 8 سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ یہ واحد رسالہ ہے جس میں ہر کہانی سبق آموز ہوتی ہے۔ 22 ستمبر سے میرے امتحان شروع ہو رہے ہیں۔ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے کام یابی سے ہم کنار کرے۔

(انیس الرحمٰن، گوجرانوالہ کینٹ)

☆ڈیئر انیس الرحمٰن! اللہ تعالیٰ آپ کو کام یاب کرے۔ آمین!

یہ میرا پہلا خط ہے، ضرور شائع کیجیے گا۔ ستمبر میں میری سال گرہ ہے۔

(فاران شاہد، لاہور)

☆ آپ کو سال گرہ مبارک ہو۔

میں تعلیم و تربیت ایک سال سے پڑھ رہا ہوں۔ میری عمر 13 سال ہے۔ پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔

(محمد فرحان، واہ کینٹ)

☆ محمد فرحان! آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

میں تین سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ 22 اکتوبر کو میری سال گرہ ہے اور امتحان میں بھی اوّل پوزیشن کی دعا کریں۔ باغبانی کے متعلق بھی کچھ شائع کیجیے۔

(رمشاء عمران، لاہور)

☆رمشاء آپ کو سال گرہ مبارک ہو اور دُعا ہے کہ امتحان میں آپ کی اوّل پوزیشن آئے۔ آمین!

اگست کا شمارہ پسند آیا۔ پچھلی بار خط شائع نہیں ہوا۔ سلسلہ ''سوال یہ ہے کہ......!'' میں جواب بھیجا ہے لیکن شائع نہیں ہوا۔

(ایمان علی، راول پنڈی)

میری عمر 13 سال ہے۔ میں 4 سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ یہ اتنا دل چسپ ہے کہ جو بھی دیکھتا ہے، پڑھتا ہے۔ میں نے انعامی سلسلوں میں حصہ لیا ہے لیکن نام شائع نہیں ہوا۔ اس بار بھی کہانی بھیج رہی ہوں۔

(مہدیہ آصف، رکن پور چھٹہ)

میں چار سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ ستمبر کا شمارہ سپرہٹ رہا۔ تمام کہانیاں شان دار تھیں۔ اپنی تحریر بھی بھیج رہا ہوں۔

(حسنین مصطفیٰ، جھگیاں قلعہ دیدار سنگھ)

ستمبر کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ سرورق پسند آیا۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ اسے ردی کی ٹوکری میں مت ڈالیے گا۔ میں تین سال سے یہ میگزین پڑھ رہا ہوں۔ فیس اور صف شکن اچھی کہانیاں تھیں۔

(حافظ محمد عبداللہ منظور، ساہی وال)

میں دہم جماعت کا طالب علم ہوں۔ کافی عرصے سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ اکتوبر میں میری سال گرہ ہے۔ تحریر بھی بھیج رہا ہوں۔ ضرور شائع کیجیے گا۔

(محمد طلحہ جمیل، جہلم)

☆ آپ کو سال گرہ پر ڈھیروں دعائیں۔

تمام کہانیاں، خاص طور پر انمول پانی، پیارے اللہ کے پیارے نام ٹاپ پر تھیں۔

(لائبہ شہزادی، راول پنڈی)

میں فرسٹ ائیر کی طالبہ ہوں۔ سائنس اور معلومات میرا خاص شوق ہے۔ آپ کو مضمون بھیج رہی ہوں۔ میری حوصلہ افزائی کیجیے گا۔

(ایمن فاری، حیدر آباد)

☆ ڈیئر ایمن! آپ کا پہلا خط بھی مجھے مل چکا ہے۔ آپ اپنا موبائل نمبر ضرور بھیجیے گا یا میگزین کے نمبر پر رابطہ کریں۔

ہم دونوں بہنیں ساتویں جماعت میں پڑھتی ہیں۔ ہمیں کہانیاں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ ہم نے اپنی تحریریں بھیجی ہیں۔ حوصلہ افزائی کیجیے گا۔

(منیبہ عارف، عالیہ عارف، ڈجکوٹ)

☆ ڈیئر منیبہ! آپ کی تحریریں قابلِ اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

میں چار سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں۔ میری سہیلیاں عائشہ اور حوا بھی پڑھتی ہیں۔

(عیبہ جمیل، لاہور)

☆ ڈیئر عیبہ، عائشہ، حوا! خوش آمدید آپ سب کو۔

ستمبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ کیفے ڈی جٹ، عید کا جوڑا، ضرب المثل کہانی اور انمول پانی بہت پسند آئیں۔

(تحریم السلام، بھلوال)

میں 2 سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ اکتوبر میں میری

امی جان کی سال گرہ ہے۔ (رمنا سعید، چیانوالی)

☆ آپ کی امی جان کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

میری عمر 13 سال ہے۔ میں 10 ماہ سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ میرا پہلا خط شائع نہیں ہوا۔ (محمد حظلہ سعید، فیصل آباد)

میں چھٹی جماعت میں پڑھتا ہوں۔ میں نے دوم پوزیشن حاصل کی ہے۔ ناول نیلی روشنی کا راز میرا پسندیدہ ہے۔ یہ اتنا معیاری رسالہ ہے کہ جو بھی پڑھتا ہے، پسند کرتا ہے۔ (طلحہٰ اعجاز، صوابی)

☆ **دوم پوزیشن حاصل کرنے پر مبارک ہو لیکن اوّل پوزیشن کے لیے خوب محنت کیجیے۔**

میں تعلیم و تربیت دو سال سے پڑھ رہا ہوں۔ میں نے کئی بار خط لکھے لیکن شائع نہیں ہوئے۔ ستمبر کا شمارہ زبردست تھا۔ نیلی روشنی کا راز لاجواب ہے۔ (محمد انیق اسد، اسلام آباد)

☆ **ڈیئر انیق! اب تو آپ ناراض نہیں ہیں؟**

ستمبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ تمام کہانیاں پسند آئیں۔ پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ ضرور شائع کریں۔ (اسمٰعیل خان، خزیمہ خان، چکسواری، آزاد کشمیر)

مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ میرے کزنز کو بھی یہ رسالہ بہت پسند ہے۔ ستمبر کا شمارہ زبردست تھا۔ ضرب المثل کہانی بہت ہی اچھا سلسلہ ہے۔ انجان راستہ، کیفے ڈی جٹ اچھی لگی۔ (زینب بنت اسلام، فیصل آباد)

میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ یہ رسالہ بہت اچھا ہے۔ میں نے کہانی بھیجی ہے، کیا وہ قابلِ اشاعت ہے؟ (ربیعہ، واربرٹن)

میری عمر 13 سال ہے۔ میں 5 سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں، یہ بہت اچھا اور معیاری رسالہ ہے۔ ناول نیلی روشنی کا راز اور انجان راستہ اچھی لگیں۔ مختصر مختصر میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ (صبغہ قمر، فیصل آباد)

میں یہ خط اپنے چھوٹے بھائی ابراہیم کی طرف سے لکھ رہی ہوں۔ اسے بھی تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ وہ ہر روز رات کو مجھ سے کہانیاں سنتا ہے۔ میں نے اس کی تصویر میری زندگی کے مقاصد کے لیے بھیجی ہے۔ (محمد ابراہیم، سرگودھا)

☆ **ڈیئر ابراہیم! باری آنے پر آپ کی تصویر چھپ جائے گی۔**

میں پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ میں دسویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ میں تعلیم و تربیت کا مستقل قاری بننا چاہتا ہوں۔ میں صبح کے وقت کام کرتا ہوں اور شام کو پڑھتا ہوں۔ (محمد عرفان اقبال، دنیا پور)

☆ **ڈیئر محمد عرفان! اللہ تعالیٰ آپ کو کام یاب کرے۔ اللہ تعالیٰ محنت کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔**

سویٹ باجی! ستمبر کے تعلیم و تربیت کی تعریف کرنا، سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ تمام کاوشیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ (عائشہ جنجوعہ عاشی، پنڈ دادنخان)

مجھے آپ کا رسالہ بہت پسند ہے اس میں بہت دل چسپ کہانیاں ہوتی ہیں۔ میں نے ایک کہانی انتقام کی ہار لکھی ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ (ماریہ خلیل، لاہور)

ستمبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ انجان راستہ بہت پسند آئی۔ (کرن فاروق، گوجرانوالہ)

ستمبر کے تعلیم و تربیت کے یوم دفاع کے حوالے سے سرورق نے 1965ء کے شہیدوں کی یاد تازہ کر دی۔ کہانیوں میں فیس اور عید کا جوڑا اعلیٰ معیار کی تھیں۔ نظموں میں قائداعظم اور چھ ستمبر بہت شان دار تھیں۔ (راجہ ثاقب محمود جنجوعہ، پنڈ دادنخان)

مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ میں تعلیم و تربیت میں کہانیاں لکھ سکتی ہوں۔ نیز سائنس کارنر میں بھی کچھ لکھنا چاہتی ہوں۔

☆ **جی ضرور! آپ تحریریں بھیجیں، مکمل پتے اور رابطہ نمبر کے ساتھ۔**

ستمبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ (محمد شباب، عبدالماجد، چکسواری، آزاد کشمیر)

ستمبر کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں شان دار تھیں۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ (ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ)

☆ **مناہل افضل اور اشمل افضل نے لاہور سے بہت دل چسپ خط لکھا ہے۔ تبصرہ بھی خوب کیا ہے اور تجاویز بھی دی ہیں۔ آپ کا بہت شکریہ۔ قلمی تعاون جاری رکھیے گا۔**

☆ **وقاص غفاری نے چارسدہ سے خط لکھا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اپنا رابطہ نمبر اور مکمل پتا بھیجیے۔**

☆ **مسز خورشید جہاں کا لاہور سے خط ملا۔ آپ اپنا رابطہ نمبر ارسال کیجیے۔**

☆ **شیزہ جاوید نے گوجرانوالہ سے بہت خوب صورت اور دلچسپ خط لکھا ہے۔ قلمی تعاون جاری رکھیے گا۔**

# آئیے عہد کریں!

اشرف صاحب ایک مہذب اور سلجھے ہوئے انسان تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے بچوں کی تربیت پر توجہ دیتے تاکہ ان کے بچے مفید شہری اور باشعور انسان بن سکیں۔ ان کی ایک عادت تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اکٹھے کھانا کھایا کرتے تھے۔ ولید ان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ ایک دن کچھ مہمان کھانے کی دعوت پر مدعو تھے۔ سب لوگ دستر خوان پر کھانا تناول کر رہے تھے۔ ولید کی ایک عادت تھی کہ وہ کھانے کے دوران بہت بولتا اور کھانا ناپسند ہوتا تو فوراً نقص نکال دیتا تھا۔ آج بھی ولید کے سامنے کھانا آیا تو اس نے پلیٹ میں کھانا نکالا۔ ابھی پہلا لقمہ اس نے حلق سے اتارا تو فوراً بول اٹھا: "امی جان آج کھانا مزے کا نہیں پکا۔" ولید کا یہ کہنا تھا کہ سب لوگ کھانا چھوڑ کر ولید کی طرف متوجہ ہو گئے۔ امی جان اور اشرف صاحب کو ولید کی نازیبا حرکت بہت ناگوار گزری۔ مہمانوں نے کھانا کھایا اور کچھ دیر بعد وہ رخصت ہو گئے۔

اشرف صاحب نے ولید کو اپنے قریب بٹھایا اور پیار سے سمجھایا کہ اگر کھانا پسند نہ آئے تو خاموشی اختیار کر لینی چاہیے کیوں کہ رزق اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے، اس لیے اس میں نقص یا ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اور کھانے کے دوران کوشش کریں کہ کم سے کم بات کریں۔ ولید نے عہد کیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا اور کھانے کے آداب کا خیال رکھے گا۔ جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں، ان کے نام آئندہ شمارے میں دیے جائیں گے۔

**شاباش** ان بچوں نے پچھلے شمارے میں عہد کیا ہے کہ پیدل چلنے کی صورت میں ہمیشہ فٹ پاتھ کا راستہ استعمال کریں گے۔

محمد عرفان اقبال، دنیا پور۔ محمد انیق اسد، اسلام آباد۔ عائشہ ندیم، مردان۔ محمد حذیفہ، آزاد کشمیر۔ سید حسن، حذیفہ مستنصر، لاہور۔ ماہ رخ آمنہ، چیچہ وطنی۔ ولید اشرف، گوجرہ۔ ثمرہ لاریب، کوہاٹ۔ لائبہ شہزاد، راول پنڈی۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ محمد حارث سعید، بورے والا۔ احمد اویس خان، چکوال۔ زینب ناصر، فیصل آباد۔ زین خان، سرگودھا۔ نمرہ رمضان، فیصل آباد۔ حاشر احمد، راول پنڈی۔ کرن طارق، سیال کوٹ۔ فرخندہ بتول، رحیم یار خان۔ ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ۔ مریم شاکر، لاہور۔ ماہ نور بٹ، لاہور۔ عیشاء نور، سیال کوٹ۔ سونیا ذوالفقار خان، مردان۔ محمد شہریار اظہر، اسلام آباد۔ ملائکہ نور، شیخوپورہ۔ محمد حماد نصیر، لیاقت پور۔ محمد فائق زاہد، فاریہ زاہد، لاہور۔ اسماء اشرف، ساہی وال۔ عبداللہ شاہد، دریا خان۔ ماہین الماس، فیصل آباد۔ ضحیٰ بدر منیر احمد، لاہور۔ تحریم السلام، بھلوال۔ کشف طاہر، گوجرانوالہ۔ عنیزہ عمران، حیدرآباد۔ محمد مزمل، گوجرہ۔ حمدہ فیصل، فیصل آباد۔ حسان فاروقی، لاہور۔ محمد احمد ریاض، اوکاڑہ۔ محمد منیب، وزیرآباد۔ عدینہ خان، اسلام آباد۔ حسنین شفیق، ٹیکسلا۔ حسن ضیاء، موہڑہ شیخاں۔ مریم صدیقہ، گوجرانوالہ۔ مریم انصاری، حیدرآباد۔ ثمامہ شہیر، گجرات۔ حیدر علی، بھلوال۔ ازکیٰ رحمٰن، راول پنڈی۔ ماہ رخ ہمایوں، لاہور۔ سید ابتصام حیدر، راول پنڈی۔ آمنہ سلیم، شرقپور شریف۔ محمد عبداللہ منظور، ساہی وال۔ محمد شیراز، باسی والہ۔ فارعہ رضوان، اسلام آباد۔ فضہ کیانی، لاہور۔

# ایسا بھی ہوتا ہے

احمد عدنان طارق

حطیم جیسے ہی کوفی شاپ میں داخل ہوا، اس نے اپنا بونوں والا نوک دار ہیٹ اتارا اور اپنی کرسی کے پیچھے دیوار میں لگی ہوئی ایک الگنی پر ٹانگ دیا۔ پھر اس نے کوفی کا آرڈر دیا۔ اس نے دکان میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر نگاہ دوڑائی۔ اس نے کاسنی جادوگرنی کو دیکھا جو مچھلی کے قتلے کھا رہی تھی۔ سب جانتے تھے کہ یہ اس کا من بھاتا کھاجا تھا۔ ایک اور بونا گرمی کی شدت سے تنگ آ کر لیموں پانی پی رہا تھا اور دُور کونے میں دو اور شناسا بونے بیٹھے ڈبل روٹی اور آملیٹ کھا رہے تھے۔ حطیم آج بہت جلدی میں تھا، تبھی اس نے صرف کوفی کا آرڈر دیا تھا تا کہ جلدی سے وہ کوفی پئے اور یہاں سے نکل جائے۔ اس نے کوفی پی کر بل ادا کیا۔ اپنا ہیٹ الگنی سے اتارا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ نیلے آسمان پر کسی بادل کا نام و نشان نہیں تھا اور چلچلاتی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔

حطیم مسکراتے ہوئے آنے والے وقت کے متعلق سوچ رہا تھا اور وہ اپنے دوست عزریق کو ملنے جا رہا تھا جو ایک خوب صورت گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ حطیم کو اس نے بلا بھیجا تھا تا کہ وہ اس کے باغ میں جو خود رو جڑی بوٹیاں اُگی ہوئی تھیں، انہیں صاف کرنے میں عزریق کی مدد کرے۔ عزریق کا گھر خاصا دُور تھا اور جلد ہی حطیم کا گرمی سے بُرا حال ہوگیا۔ اس نے دل ہی دل میں دُعا مانگی کہ کاش کوئی بیل گاڑی ہی آ جائے۔ تو وہ اس پر سوار ہو جائے۔ جیسے ہی اس کی دُعا مکمل ہوئی، اپنے عقب میں اس نے ایک بیل کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آواز سنی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک بڑی سی بیل گاڑی آ رہی تھی جس کے اوپر ایک بدصورت بونا بیٹھا بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ اس نے بیل گاڑی کو روک کر حطیم کو بیل گاڑی پر سوار کیا اور پھر ٹخ ٹخ کر کے بیلوں کو آگے بڑھانے لگا۔ حطیم انتہائی حیران تھا کہ اس نے تو دل میں خواہش کی تھی پھر اس گاڑی بان نے بغیر پوچھے اسے کیسے بٹھا لیا، لیکن اب وہ خوش تھا کہ پیدل چلنے سے یہ گاڑی کہیں ٹھیک ہے۔ بونا اتنی تیزی سے بیل گاڑی ہانک رہا تھا کہ کچھ دُور تک جاتے ہی حطیم کے جسم کی چولیں ہل گئیں، کیوں کہ جیسے جیسے گاڑی پتھروں کے اوپر سے گزرتی، جھٹکوں سے حطیم کا جوڑ جوڑ ہل جاتا۔ اس نے دل میں خواہش کی کہ کاش بیٹھنے کے لیے دو تین نرم تکیے ہوتے ورنہ اس طرح تو اس کے زخمی ہونے کا پورا امکان تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا

تھا کہ خود بخود دو تین تکیے اس کی پیٹھ اور کمر کے نیچے نمودار ہو گئے۔ حطیم انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے بدصورت گاڑی بان سے پوچھا۔ ''کیا تم نے یہ تکیے پھینکے ہیں؟''

مگر وہ خاموشی سے گاڑی بڑھاتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب حطیم آرام سے سفر کر رہا تھا۔ اچانک اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ''اتنی گرمی ہے کاش لیموں پانی کی بارش ہو جائے تو مزہ آ جائے۔'' ابھی الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ کہیں سے آسمان پر پیلے بادل کا ایک ٹکڑا بیل گاڑی کے عین اوپر بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا اور آسمان سے لیموں پانی کے بڑے بڑے قطرے برسنے لگے۔ کئی منٹ تو حطیم بھونچکا بیٹھا رہا۔ آخر اس نے زبان نکال کر پیلے لیموں پانی کے قطروں کو چکھا اور پھر منہ کھول کر برستے ہوئے لیموں پانی کا مزہ لینے لگا۔ لیموں پانی کے قطرے اتنے ٹھنڈے اور میٹھے تھے کہ حطیم نے زندگی میں نہیں چکھے تھے۔ اس نے جی بھر کر لیموں پانی پیا لیکن اتنی دیر میں اس بارش سے وہ مکمل بھیگ چکا تھا۔ اس نے بارش بند ہونے کی دُعا مانگی تو فوراً بارش بند ہو گئی۔ پیلا بادل غائب ہو گیا اور آسمان مکمل نیلا ہو گیا۔

اب حطیم کو یقین ہو گیا تھا کہ آج اس کی ہر خواہش پوری ہو گی۔ اگرچہ وہ قطعی اس کی وجہ نہیں جانتا تھا، پھر بھی اس نے مزید خواہش کرنے کا ارادہ کیا تاکہ یہ بات ثابت ہو جائے۔ پھر اس نے صرف آزمانے کے لیے خواہش کی کہ کاش اس کے پاس سونا جڑی بگھی ہو جسے تین زرافے کھینچ رہے ہوں۔ فوراً اس کی خواہش پوری ہو گئی۔ اسے سامنے کھڑی چمکیلی بگھی نظر آئی جس کے آگے لمبے لمبے تین زرافے جتے ہوئے تھے۔ وہ چھلانگ لگا کر بیل گاڑی سے اتر گیا۔ بگھی میں بیٹھتے ہی اس نے خواہش کی کہ اس بگھی کا کوچوان ایک ببر شیر ہو اور بگھی کے پیچھے کھڑے ہونے کے لیے دو ملازم کنگرو ہوں۔ فوراً اس کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی اور ایک ببر شیر کوچوان کی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ اس نے بڑی ہی پیاری وردی پہن رکھی تھی اور ملازم کنگرو بھی وردی میں ملبوس تھے جو بگھی کے پچھلے پائیدانوں پر کھڑے تھے۔ پھر اس نے اپنے لیے سونے اور چاندی سے بنا ہوا لباس منگوایا اور اسے پہن کر خود کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہا۔ اس نے ببر شیر کے کان میں اپنے دوست عزیق کے گھر کا راستہ بتایا اور خود اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے خواہش کی کہ جنگل میں پائے جانے والے سارے جانور اس کی بگھی کے پیچھے پیچھے آئیں۔ انہوں نے روپہلی وردی پہنی ہو اور ہر ایک کے ہاتھ میں اس کے دوست کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ہو۔ تب اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب سب جانور بگھی کے پیچھے نمودار ہو گئے۔ ایک ہاتھی سنہری لباس پہنے آ رہا تھا، ان جانوروں مین اونٹ بھی تھا جو اپنی دو کوہانوں میں عزیق کے لیے تحفہ دبا کر لا رہا تھا۔ جانوروں میں خراماں خراماں چلتا ہوا ایک پانڈا بھی تھا اور سبک خرام شتر مرغ بھی۔

حطیم سوچ رہا تھا کہ عزیق جب یہ سارا قافلہ دیکھے گا تو اس کے اوسان خطا ہو جائیں گے۔ اس کی ہمیشہ سے عادت ہے کہ وہ شیخی بگھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب وہ یہ سب دیکھے گا تو پھر کبھی شیخی نہیں بگھارے گا۔ وہ اتنا پُر جوش تھا کہ اس سے وقت گزارا نہیں جا رہا تھا۔ آخر کار بگھی میں جتے ہوئے زرافے اس کے دوست کے گھر کے گیٹ کے سامنے رُک گئے۔ حطیم نے دُور سے ہی عزیق کو گھر کے لان میں دیکھ لیا تھا لیکن عزیق نے شیر کو کوچوان کے روپ میں دیکھا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا بیلچہ وہیں پھینکا اور

## زبان کا سفر

**سیف:** عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں تلوار۔ ''سیف'' سے مراد ریت کے ٹیلے کا وہ کنارا جو دیکھنے میں تلوار کی دھار کی طرح نظر آتا ہے۔ ''سیف'' جب انگریزی میں پہنچا تو SEIF بن گیا۔ یہ لفظ ریت کے ایسے ٹیلوں کے لیے بولا جاتا ہے، جو ہوا کے متوازی ہوتے ہیں اور تلوار کی مانند ہو جاتے ہیں۔ ''سیف'' نے انگریزی میں رہتے ہوئے اپنی شکل بدلی اور زف (Xiph) اور زفو (Xipho) بن گیا۔ معنی وہی ہیں، تلوار۔ اس زف سے انگریزی میں مزید کئی الفاظ بن گئے مثلاً زیفوئڈ (Xiphoid) یعنی تلوار کی شکل کا۔ اس طرح تلوار کی شکل کے پتوں والے ایک پودے کو زیفوپیگس (Xiphopagous) کہتے ہیں۔
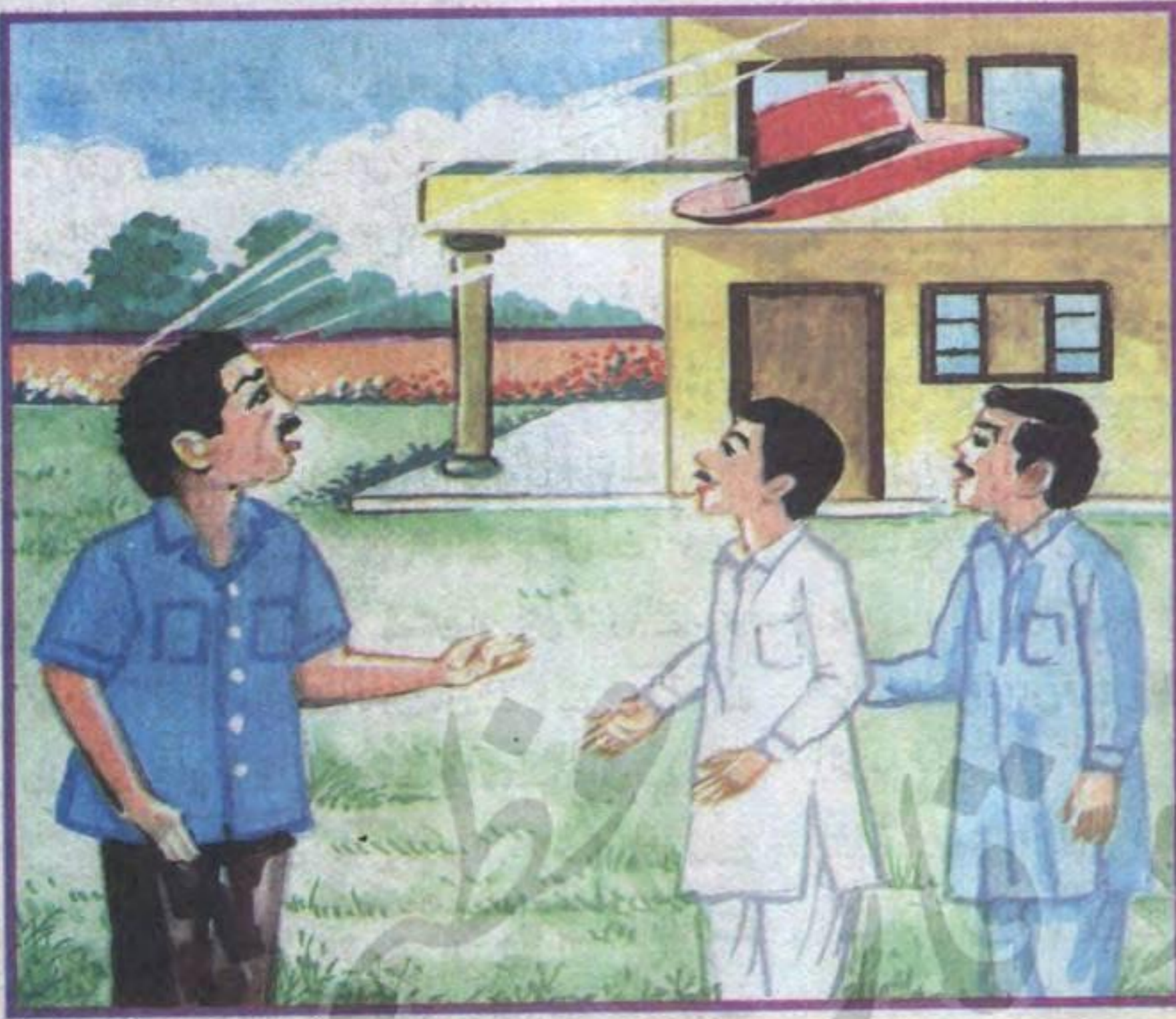
بھاگ کر اپنے گھر میں گھس گیا۔ حطیم نے اونچی آواز میں عزریق کو ساری بات بتائی اور شیر سے نہ ڈرنے کو کہا۔ پھر وہ بھی باہر نہ نکلا تو حطیم دیوار پھلانگ کر عزریق کے گھر میں چلا گیا اور اسے سارا قصہ سنایا تو آخر کار اس نے حطیم پر یقین کر لیا۔

لیکن پھر بھی اس کی نگاہیں حطیم کے خوب صورت لباس سے نہیں ہٹ رہی تھی اور اس کا دماغ مسلسل حطیم کی خواہشوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ حطیم نے اسے بتایا کہ اسے بھی علم نہیں کہ یہ خواہشیں کیسے پوری ہو رہی ہیں؟ ضرور کوئی جادو ہے جو اس کے جسم میں سرایت کر گیا ہے۔ عزریق نے حطیم کو کہا کہ چوں کہ اس کا سارا دن بہت مصروف گزرا ہے اور پھر اب تو وہ لان میں اُگی ہوئیں جڑی بوٹیاں بھی صرف خواہش کرنے سے ختم کر سکتے ہیں، لہٰذا وہ آرام سے کرسی پر بیٹھے اور ہیٹ اتار لے اور پھر خوشی سے ہنسنے لگا۔ حطیم بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا اور ہیٹ اتار کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس نے عزریق کو بتایا کہ غالباً یہ ہیٹ اس کا نہیں ہے اور وہ کوفی شاپ سے اسے غلطی میں تبدیل کر لایا ہے۔ جب ہی تو سارے راستے اس کا سر دُکھتا رہا ہے کیوں کہ یہ ہیٹ سر پر پہنے اسے تھوڑا تنگ لگ رہا تھا۔ اس نے خواہش کی کہ یہ ہیٹ اس کے مالک کے پاس چلا جائے اور میرا ہیٹ مجھے واپس مل جائے۔ ابھی وہ یہ لفظ بول ہی رہا تھا کہ ''زوں'' کی آواز سے ہیٹ اس کے ہاتھ سے نکل کر واپس کوفی شاپ کی طرف روانہ ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے اس کا اپنا ہیٹ اس کے ہاتھ میں تھا، لیکن یہ کیا؟ اس کے قیمتی کپڑے بھی غائب ہو گئے تھے۔ اب اس کے جسم پر اس کے پرانے کپڑے تھے اور اس کے پیچھے پیچھے سارے جانور بھی اور ظاہر ہے ان کے لائے ہوئے تحفے بھی ساتھ ہی واپس چلے گئے۔ ''ارے یہ کیا ہوا؟'' حطیم کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس نے دل میں بار بار خواہش کی کہ سب جانور واپس آ جائیں مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی اور جانور واپس نہ آئے، وہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے تھے۔ ''اوہ! خدایا......'' سخت مایوسی میں حطیم منہ بسور رہا تھا۔ اب مجھے پتا چلا ہے کہ میں نے کوفی شاپ سے کاسنی جادوگرنی کا ہیٹ غلطی سے لے لیا تھا اور وہ ہیٹ پہن کر جو خواہش کی جائے، وہ پوری ہو جاتی تھی۔ وہ ہیٹ پہن کر میں نے بھی جو خواہش کی وہ پوری ہو گئی مگر اب جب میں نے اپنا ہیٹ پہنا ہے تو میری کوئی خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔

''چھوڑو یار!'' عزریق اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہم صرف خواہش کر کے تمام لان کی جڑی بوٹیاں تلف کر سکتے تھے۔ ہمیں چانس ملا مگر ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ اب اٹھو ہمیں ڈھیر سارا کام کرنا ہے۔'' دونوں اُداس دوست اٹھے اور جب وہ کام سے فارغ ہو کر نیند کی وادی میں گئے تو ساری رات انہیں شیروں، زرافوں اور کنگروؤں کے خواب دکھائی دیتے رہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس رات وہ خواب میں کچھ اور بھی دیکھ سکتے تھے؟

''نہیں......!'' وہ چیختا ہوا واپس مڑا مگر اس سے پہلے کہ وہ بھاگتا، پنجوں جیسے دو استخوانی ہاتھوں نے اس کو گردن سے دبوچ لیا۔''ہاہاہا!......تم ہم سے بچ کر کہاں جاؤ گے......ہی ہی ہی...... کون ہے جو ہم سے بچ سکے؟'' ڈریکولا جیسی اس مخلوق نے ایک خوف ناک اور مکروہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور اسے اٹھا کر قبرستان کی سمت بڑھنے لگی۔ ڈریکولا ہی کی طرح اس کے سامنے کے دو لمبے اور پیلے دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے جب کہ سر پر دو خطرناک سینگ ابھرے ہوئے تھے جنھوں نے اسے اور بھی خوف ناک بنا دیا تھا اور اس سے نامانوس بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

''چھوڑ دو مجھے......میں کہہ رہا ہوں چھوڑ دو......کہاں لے کر جا رہے ہو مجھے؟'' وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور زور زور سے چلّا رہا تھا مگر وہ ہر چیز سے بے نیاز بس مشینی انداز میں قبرستان کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی۔

یہ حارث تھا جو ماں کے منع کرنے کے باوجود رات گئے چہل قدمی کے لئے گھر سے نکل آیا تھا۔ وہ نہر کو جانے والی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مگن گنگناتا جا رہا تھا کہ اچانک نہ جانے کہاں سے وہ ڈریکولا جیسی خون آشام مخلوق نمودار ہوئی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ فوراً واپس بھاگنے کے لئے مڑا مگر بلا نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور چلتی بنی۔ اب وہ قبرستان کے قریب پہنچ چکی تھی۔ حارث نے آزاد ہونے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بے سود۔ آخر کار بلا قبرستان میں داخل ہوگئی۔ قبرستان کا دل دہلا دینے والا منظر دیکھ کر حارث نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ دُور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت سے کتے مل کر رو رہے ہوں۔ وہ جیسے ہی قبرستان کے درمیان میں پہنچے تو اچانک کسی درخت سے الو کی ایک مکروہ چیخ بلند ہوئی اور وہ پھڑ پھڑا کر اڑ گیا۔ اس کی لمبی سی چیخ قبرستان میں گونج کر رہ گئی تھی۔ شاید اس نے کسی غیر معمولی بات کو قبل از وقت محسوس کر لیا تھا۔ حارث کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا مگر وہ خوف ناک بلا ہر چیز سے بے نیاز آگے بڑھتی رہی۔ آخر کار وہ قبرستان کے دوسری طرف نکل گئی۔ حارث نے آنکھیں کھول کر دیکھا قبرستان سے کچھ آگے ایک ویران حویلی کے کھنڈرات تھے۔ بلا اس حویلی کے کھنڈرات میں داخل ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ حارث کو لئے ایک تہہ خانے میں پہنچ گئی۔ تہہ خانے کا منظر نہایت خوف ناک تھا۔ اس کے درمیان میں ایک قطار میں دیوہیکل بت رکھے ہوئے تھے۔ ایک کالی ماتا

کا، دوسرا ناگ دیوتا کا اور تیسرا ڈریکولا سے مشابہ کسی بلا کا تھا جس کی لمبی، کالی اور خون آلود زبانیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں جیسے وہ خون پینے کے انتظار میں ہوں۔ باہر کو نکلی ہوئی ان کی خون آلود زبانوں نے انھیں اور بھی وحشت ناک بنایا تھا۔ ان بتوں کے قدموں میں ایک قدرے اونچا چبوترہ بنا ہوا تھا جو اپنی ہیئت سے کسی قربان گاہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔

"ہاہاہا! اب مزہ آئے گا جب میں اپنے دیوتاؤں کو انسانی قربانی پیش کروں گا۔ پھر میں اس جوان اور گرم گرم خون سے غسل کروں گا تو میری شکتی بہت بڑھ جائے گی۔ میں پھر سے جوان ہو جاؤں گا۔ ہاہاہا!" اس بلا نے حارث کو اسی طرح دبوچے ہوئے ایک مکروہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اب تو حارث کی ہمت بالکل ہی جواب دے گئی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس کی آواز سن کر وہاں اس جیسی مگر اس سے چھوٹی کئی بلائیں نمودار ہونے لگیں، وہ سب بھی مکروہ قہقہے لگا رہی تھیں اور خوشی سے چلاّ رہی تھیں۔

"ہاہاہا!...... ہی ہی ہی!...... پورن ماشی کی رات...... ہاہاہا!...... انسانی خون......"

آج پورن ماشی کی رات تھی۔ یہ رات ہر ماہ چاند کی اکیس تاریخ کو منائی جاتی تھی جس میں شیطانِ اعظم ابلیس اپنی شیطانی طاقت بڑھانے کے لیے اپنے دیوی دیوتاؤں کے قدموں میں کسی زندہ انسان کی بلی چڑھاتا تھا اور پھر اس کے تازہ اور گرم خون سے نہاتا تھا۔ یہ بلا اصل میں شیطان لعین ہی تھا جو آج کی رات قربانی کے لیے کسی انسان کی تلاش میں نکلا تھا اور بدقسمتی سے حارث اس کے ہاتھ لگ گیا جسے وہ اٹھا کر اپنے اس شیطانی ٹھکانے پر لایا تھا۔ چھوٹی بلائیں اس کے چیلے تھے۔ کچھ دیر تک وہ سب خوشی سے چیختے چلاّتے اور ناچتے رہے، پھر ابلیسِ اعظم نے حارث کو قربان گاہ کے چبوترے پر پٹخا اور اس کی مکروہ آواز تہہ خانے میں گونجنے لگی:

"اسے باندھ دیا جائے اور قربانی کی تیاریاں مکمل جائیں۔"

یہ کہہ کر وہ تہہ خانے سے نکل گیا۔ اس کے چیلوں نے حارث کو چبوترے پر رسیوں سے جکڑ دیا۔ اب وہ سوائے گردن کے، جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ اسے چبوترے پر اچھی طرح باندھ دینے کے بعد وہ سب چلے گئے۔ ابھی رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور قربانی ٹھیک بارہ بجے دی جانی تھی، حارث کو اپنی رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب وہ ماں کے منع کرنے کے باوجود گھر سے نکلا تھا۔ اس کی ماں نے اسے بارہا سمجھایا تھا کہ وہ رات کو گھر سے نہ نکلا کرے مگر وہ ہر بار ماں کی نصیحت کو اپنی آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہوئے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا تھا۔ اب اسے شدت سے ماں کی نصیحت یاد آ رہی تھی مگر

"اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

"یااللہ! میں کیا کروں؟ کیسے بچوں؟......اے اللہ! تو آج مجھے بچا لے......میرے گناہوں کو معاف فرما......یااللہ! میری حفاظت فرما...... مجھے نجات کا کوئی راستہ سجھا......میری مدد کر...... مجھے یہاں سے نکال......یااللہ! تو غفور و رحیم ہے......مجھ پر بھی رحم فرما۔" اب وہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ اس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا کہ وہ اسے اس مشکل سے کسی طرح نجات دے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ رو رو کر دعائیں مانگ رہا تھا...... فریاد کر رہا تھا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اچانک ہی بجلی کڑکنے لگی اور بادل زور زور سے گرجنے لگے۔ حارث کو یوں لگا جیسے کوئی زلزلہ آ رہا ہو اور ابھی تہہ خانہ ملیا میٹ ہو جائے گا۔ اچانک بجلی کا کان پھاڑ دینے والا کڑاکا ہوا جس کے ساتھ ہی ابلیسِ اعظم تہہ خانے میں نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چیلے بھی تہہ خانے میں پہنچ گئے۔

"دیوتاؤں کے قدموں میں قربانی دی جائے اور مجھے اس کے خون سے غسل دیا جائے۔" ابلیسِ اعظم کی مکروہ آواز تہہ خانے میں گونجی۔

یہ سنتے ہی حارث کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ اسے اپنی موت صاف دکھائی دینے لگی۔ اس نے کلمہ پڑھنے کی کوشش کی لیکن خوف کی زیادتی کی وجہ سے اس کی آواز ہی نہ نکل سکی۔ وہ بے بسی سے تہہ خانے کی چھت کو دیکھنے لگا جیسے نگاہوں
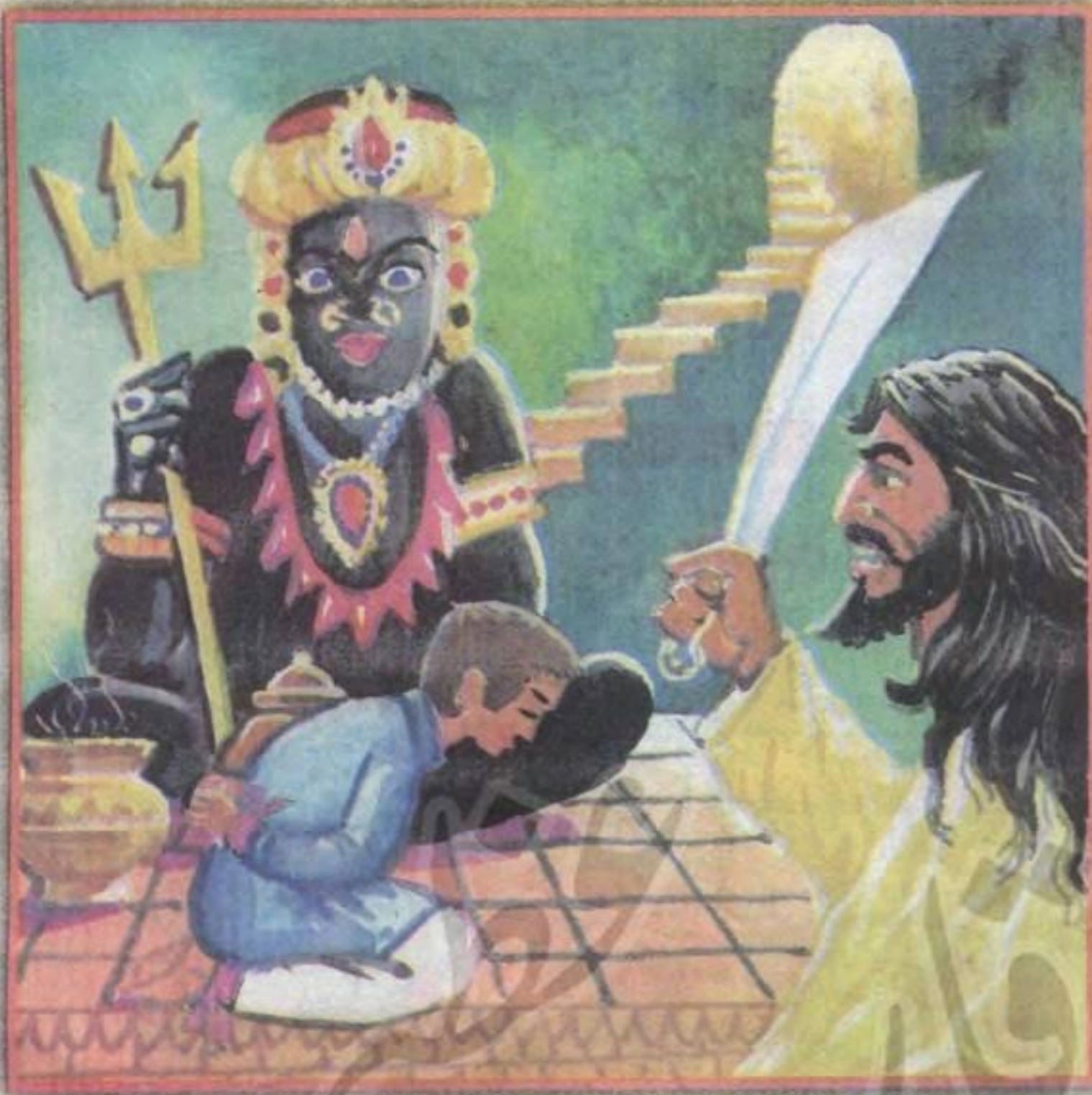
ہی نگاہوں میں خدا سے فریاد کر رہا ہو۔

بتوں کے قریب چبوترے پر ابلیسِ اعظم کے لئے ایک مخصوص کرسی لا کر رکھ دی گئی اور وہ اس پر براجمان ہو گیا۔ اس کے ایک چیلے کے پاس بکرے ذبح کرنے والا ایک بہت بڑا چھرا تھا۔ وہ چھرا لے کر حارث کی گردن کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ابلیسِ اعظم سمیت تمام چیلے کوئی منتر پڑھنے لگے۔ منتر ختم ہوتے ہی وہ بتوں کے قدموں میں سجدے میں گر گئے۔ سجدہ کرنے کے بعد ابلیسِ اعظم نے تحکمانہ لہجے میں کہا:

''قربانی پیش کی جائے!''

یہ سنتے ہی شیطان کے چیلے نے چھرے والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور پھر ایک ہاتھ سے حارث کا چہرہ پکڑ کر گردن گھمائی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن پر چھرا چلانے لگا۔

''نہیں!......!'' درد کی شدت سے وہ زور سے تڑپا۔ اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

''بچاؤ...... بچاؤ...... خدا کے لیے مجھے بچا لو...... ہے کوئی؟''

وہ زور زور سے چیخ رہا تھا۔ اس کی چیخوں کی آواز سن کر سب گھر والے اس کے کمرے کی طرف بھاگے آئے۔

''کیا بات ہے؟ کیوں چیخ رہے ہو؟'' اس کی ماں نے پوچھا مگر حارث نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ اسی طرح ہذیانی انداز میں چیختا رہا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اپنی گردن پر رکھا ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟ یہ تم نے اپنی گردن کیوں پکڑی ہوئی ہے؟'' اب اس کی ماں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''مم...... میری گردن...... ارے! یہ تو بالکل سلامت ہے۔ یااللہ! تیرا شکر ہے، تو نے مجھے بچا لیا۔'' حارث نے غائب دماغی سے کہا۔ اب اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اور سب گھر والے اس کے کمرے میں پریشان کھڑے تھے۔ اب اسے پتا چلا کہ وہ ایک خوف ناک خواب دیکھ رہا تھا۔

''اوہ خدایا! شکر ہے، یہ سب ایک خواب تھا...... مگر ایک بھیانک خواب۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کی ماں نے اس کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا:

''بیٹا! اب بتاؤ...... کیا بات تھی جو تم یوں خوف زدہ ہو کر چیخ رہے تھے اور 'بچاؤ بچاؤ' چلا رہے تھے؟''

ماں کی بات سن کر وہ انہیں اپنا خواب سنانے لگا۔ خواب سن کر اس کی ماں نے کہا:

''بیٹا! میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ شام کے بعد گھر سے نہ نکلا کرو۔ رات کو دیر تک باہر نہ رہا کرو مگر تم ہو کہ کچھ سنتے ہی نہیں۔''

''مجھے معاف کر دیں امی جان...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا اور آپ کی ہر بات پر عمل کیا کروں گا۔'' حارث نے روتے ہوئے اپنی ماں سے معافی مانگی تو سب مطمئن ہو کر اپنے اپنے کمروں کو چل دیے۔ اب وہ بھی اپنے آپ کو نہایت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ یہ خوف ناک خواب واقعی اس کے حق میں رحمت ثابت ہوا تھا۔

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/ اکتوبر 2013ء ہے۔

ستمبر 2013ء کے ”بلاعنوان کارٹون“ کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی **500** روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- ہو کیوں بھائی تم پریشان تمہاری نشست ہے عالی شان۔ (وردہ مصطفیٰ، کراچی)
- آؤ برخوردار دنیا کیوں رہتی ہے تم سے بیزار۔ (محمد عمر عباس آوانہ، گجرات)
- اب نہ کر تکرار، موت کے لیے ہو جا تیار۔ (ثمینہ فرخ راجہ، جہلم)
- چڑھ جا بیٹا سولی رام بھلی کرے گا۔ (سیدہ نور المنتہٰی، راول پنڈی)
- انداز مجرمانہ، سزا شاہانہ۔ (حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)
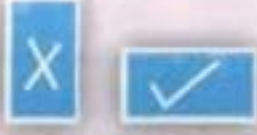
ہونہار مصور
محاذِ جنگ
تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔
ماریا سہیل، اٹک (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)
عمارہ علی، لاہور (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)
شیزہ جاوید، گوجرانوالہ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)
کشف طاہر، گوجرانوالہ (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)
مریم جاوید، لاہور (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)
زین العابدین شاہ، رحیم یار خاں (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)
کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: ماریا سہیل، اٹک۔ مومنہ احسن، فیصل آباد۔ محمد کلیم اللہ چیمہ، اسلام آباد۔ عثمان احمد، شکرگڑھ۔ سلیمان علی اعوان، ٹیکسلا۔ زونا کشف افضل، میاں والی۔ محمد طٰین آفتاب، کراچی۔ محمد فرحان، راول پنڈی۔ محمد بلال عباس، لاہور۔ تحریم اسلام، بھلوال۔ ثمرین خالد لاشاری، مظفر گڑھ۔ محمد عبداللہ گل، راول پنڈی۔ زونا مریم، گوجرانوالہ۔ سنبل ماہین، سرگودھا۔ سارہ حامد، فیصل آباد۔ زویا نوید، واہ کینٹ۔ حائقہ نور، اسلام آباد۔ زین خان، سرگودھا۔ محمد احمد جواد گل جگنو، بہاول نگر۔ طلحہ محمود، سرگودھا۔ مصطفیٰ کمال، لاہور۔ آسیہ، جہلم۔ ایمان احمد، سرگودھا۔ یعقوب علی، ملتان۔ ثمرہ نور، میاں والی۔ طلعت حسین، گجرات۔ ایوب خاں، لاہور۔ طارق ریاض، شیخوپورہ۔ کوثر جہاں، راول پنڈی۔ کنزہ فاطمہ، لاہور۔ نادرہ زیدی، کراچی۔ نعیم خان، حیدرآباد۔ سارہ ریاض، قلعہ دیدار سنگھ۔ ثمین فاطمہ، کوئٹہ۔ ستار احمد، بنوں۔ قربان علی، جھنگ۔
ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔
نومبر کا موضوع
شیرنی اور اس کے بچے
آخری تاریخ 8 نومبر
اکتوبر کا موضوع
قائد ملت لیاقت علی خان
آخری تاریخ 8 اکتوبر